Women Writ

Classics

افسانے

ایک بات

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS

Low Priced Series

ایک بات

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز ۔ ٹیمپل روڈ لاہور

ایک بات

ترتیب

ایک بات

کہتے ہیں ایک آدمی تھا- اس کی تھیں چار بیویاں اور کمبختنیں سب کی سب توتلی- ایک دن چند دوستوں کی دعوت کی- میاں نے سختی سے بولنے کو منع کر دیا- کہ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے- پر جب انہوں نے کھانے کی تعریف کی تو بیویوں کا جی نہ مانا اور بول ہی اٹھیں- تین تو خیر اپنی اپنی تعریف میں بولیں- پر چوتھی بیوی نے کہا- "بھلا ہوا جو ہم نہ بولے- میاں آئیں گے تو جوتے لگیں گے-"

تو صاحب وہ جوتے لگے- مگر سب سے زیادہ ان آخری بولنے والی کے-

تو آج کل ساقی سب کی باتیں سن رہا ہے تو ہم کیوں چپ رہیں- آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں- آج کل باتوں کا عام موضوع "نیا ادب" ہے- ہمدرد لوگ انسانیت' اخلاق' ادب اور تہذیب کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس شتر بے مہار یعنی نئے ادب کے پیچھے ہر قسم کے ہتھیار لے کر حملہ آور ہوئے ہیں اور قبلہ اونٹ صاحب کچھ بوکھلائے سے نظر آ رہے ہیں- اللہ جانے کس کروٹ بیٹھتے ہیں یا اور بدحواس ہونے کا ارادہ ہے-

سنا ہے جب اونٹ کو غصہ آتا ہے تو دشمن کی کھوپڑی اتار لیتا ہے- کیا معلوم بھئی!

اور ذرا ہتھیار ملاحظہ ہوں اور بدکانے والے!

"نیا ادب فحش نگاری ہے-"

"نیا ادب سوائے جنسی الجھنوں کے کچھ نہیں!!"

"نیا ادب گر رہا ہے!!!"

یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا شانہ سے دوپٹہ ڈھکا اور ان کی آنکھوں میں خون اترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصہ جسم سے کیوں جلتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ محترمہ خود چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی کھٹائی کی شکل کی تھیں۔ لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ بچاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں اور نانایں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں۔

یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کر دیا ہے اور وہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یہ مانا کہ یورپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بچپنے ہی سے کچھ اس انداز کی ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت ہی نہیں رہ جاتی۔ وہ جب اس کے متعلق پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی اور یہاں سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لئے زندہ چھوڑ دیں کیوں نہ اس کا بھن جلد از جلد کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے۔ اور نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں۔ دشمن دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں؟

مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی۔ باقی مطلب کی باتیں معلوم ہی نہ ہوئیں۔ لہٰذا نظر انداز کر دیں مگر یقیناً عریاں جملے سو سو بار رٹے۔ ذرا غور کیجئے عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا برا۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول کو بھی دکھائی جائے اور بیکار سڑکوں پر ننگے گھومنے لگیں۔ لیکن اگر غسل آفتاب کے لئے کسی ضروری حصہ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم۔

اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو جائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج

کہتے ہیں اور وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں قابل رحم ہیں- یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس عریاں ادب کے آئینے میں نہ جانے کیا لوگوں کو جھلک نظر آتی ہے کہ وہ اینٹا لے کر غریب آئینے پر دانت پیس کر دوڑتے ہیں' بھلا سوچئے تو اس میں آئینہ کا قصور ہی کیا؟

شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے- ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے- اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں- کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھئے' صاحب یہ تو زندگی کی تصویر ہے کھلی بھی ہے ڈھکی بھی ہے- اگر عریانی ہے بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے- ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرزے جاتے ہیں- یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرز اٹھا ہے اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے- وہ تو صرف حروف میں انہی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہو رہی ہیں- نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے- برسوں بعد بھی جب یہ نیا ادب نیا نہ رہے گا تب بھی اسی طرح سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا- یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی- اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دنیا گندی ہے' جس کی یہ تصویر ہے- مصور کا کیا قصور؟

تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے اقتصادیات کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا- خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں- پھر بھی دبا چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا- اس نئے ادب سے پہلے رومان اور مزاح کا زور تھا- پطرس' عظیم بیگ' رشید احمد' شوکت تھانوی' امتیاز علی تاج' فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے تھے- ذرا غور سے پڑھئے' وہی بیوی کے مظالم' دوستوں کی خوش مذاقیاں' گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات بار بار لکھتے تھے- ہاں یہ بات اور تھی کہ سب کا رنگ جدا تھا اور اب نئے ادیب کیا لکھ رہے

ہیں، جنسی الجھنیں، امیر و غریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ دنیا کی تلخیاں! یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے ارے صاحب ملیریا پھیلتا ہے تو سب کو کونین ہی دیتے ہیں۔ دکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں۔ کوئی گانا تو نہیں ہو رہا جو سُر تال میں ہو پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی اور اب آپ جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے دنیا ننگی، بھوکی، چور، اچکی اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں۔ کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزار نسیم لکھنے لگیں۔ فسانہ آزاد اور مذاقیہ کہانیاں لکھتے چلے جائیں۔ نئے ادیب زیادہ تر ننگے بھوکے اور حساس ہیں۔ دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ذرا سی چوٹ سے بھنا اٹھتے ہیں۔ ان کے بھیانک خواب جن کی او ر بھی بھیانک تعبیریں، یہ ہماری دنیا کا نقشہ ہے۔ برا ہے یا اچھا۔ یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھ میں ہو گا۔ کہ وہ اسے سینہ سے لگائے یا ٹھکرائے۔ ہم اور آپ کبھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور آپ کا فیصلہ بیکار ہے کیونکہ وہ بے اثر ہو گا۔ نیا ادب جو کچھ بھی ہے، وہ موجودہ نوجوانوں کی پکار ہے جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے۔ وہ دب نہیں سکتا۔ آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے وہ چیخے گا------ دکھ ہو گا تو روئے گا۔ یہ جو جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے۔ اسی طرح کہانیوں میں جھلکے جائے گی۔ جب بھوک ہی ٹھہری تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے۔ یہ جنسی پکار جو افسانوں میں نظر آ رہی ہے۔ کیا ان کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالات سے کچھ بھی نہیں۔ کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی۔ آپ نے ڈیمانڈ اور سپلائی (DEMAND, SUPPLY) کے متعلق اکنومکس میں پڑھا ہو گا ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھئے۔ جنس ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی----- مگر مارکٹ نہیں۔ یعنی عورتیں بھی ہیں

اور مرد بھی اور خواہشات بھی، مگر ان کا ذکر بے شرمی، ہندوستان کے لوگ غریب ہیں ------ اکثر نادار ہیں، ناداری میں شادی مصیبت ----- ناداری میں عیاشی گناہ----- ناداری میں جینا منع کیوں؟ آخر کیوں؟ ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو الٹا ہمارے لئے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی چمڑی میں مگن رہتے مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے جوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عیب، ہر بات گندی، عریاں اور مخرب اخلاق، وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جرم! خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو کم از کم احساس ہی کند ہوتا۔ کاش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے نہ دیکھتے نہ دکھ سکھ سے چلاتے۔ زمانہ کی ٹھوکروں میں لڑھکتے فنا کی طرف چلے جاتے مگر نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی، بدمزاج اور اکھڑ ہے۔ وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک نئے نظام کے لئے بیکل ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے متنفر، غصبہ ہو ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبا رہا ہے۔ خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر پھینک رہا ہے اور کل وہ اس مقام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا۔ مگر اس نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا۔ کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا---- اور جو باقی رہے گا وہی نئے نظام کی تکمیل کرے گا۔

یہ نظام کیا ہو گا؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہو گا----- فاقے---- جنسی اور رومانی مسائل نہ ہوں گے، بدمعاشی نہ ہو گی، طوائفوں کے اڈے نہ ہوں گے اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے جہاں انسان رہے گا---- عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ موریوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ مرد حیوانیت سے دور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہوں گے وہ انسان مانے جائیں گے اور انہیں صرف سماج کا پیٹ

بھرنے کے لئے حلال نہیں کیا جائے گا۔ شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان کو مکمل زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو گا۔

نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے سارے لوازمات جو باپ دادا کی وارثت بن گئے ہیں۔ انسان کا حق ہو جائیں گے۔ نئی دنیا کے دکھ بہت بڑھ گئے اور نیا ادب اسی دنیا کے دکھوں کی آہ ہے۔ جو دنیا کے ہر ذی روح نوجوان کے چور چور جسم سے نکل رہی ہے۔ طعنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بڑھیاں طعنے دیتی مر گئیں----- بوڑھے لاحول بھیجتے چل دیئے۔ مگر نوجوان زندگی کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ بزدل نہیں اور اسے بے شرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال آتا ہے تو اس میں زنانہ مردانے ادب کا کیا سوال۔ جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا ہے۔ مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

نئے ادب کا مقابلہ ایک بزرگ جنسی کتابوں سے کرتے ہیں' بالکل ٹھیک لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لئے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جنسی معلومات پر کتابیں طبی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں۔ لیکن لوگ ان سے ادبی ذوق فرمانے لگے۔ اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالہ کے جب کونین نکلتی ہے تو غریب ادیب کے جنم میں تھوکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے! ان فضول طعنوں کی پرواہ نہ کیجئے۔ یہ اعتراض کب نہیں ہوئے؟ کس نے نہیں کئے؟ سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو؟ نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں یہ بزرگوں کے لئے ہے بھی نہیں۔ کچھ کہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجئے۔ لکھئے

ضرور لکھئے۔ جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں۔ سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھئے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں، کچھ بھیانک درندے ہیں۔ کچھ خوفناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لئے اسے لکھ جایئے۔ اس کا سبق آپ کے ہی تجربے ہوں گے۔ آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا، برا، کڑوا، کسیلا سب کچھ لکھ دیجئے اور وہ خوراکیں جو ہمارے شریر مریض پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلے جاتے ہیں آئندہ نسلیں انہیں فخریہ احترام سے لیں گی۔ کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھ دار، روشن دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی پیدا ہو گی۔ اس کے لئے یہ خوراکیں بھاری ہوں گی۔ وہ نسل واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پرکھے گی۔ اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے پھڑپھڑا جائیں جیسے شیر کی بو پا کر گھوڑا بدکنے لگتا ہے۔ لکھئے اور اتنا لکھئے کہ یہ ان کے لئے بالکل معمولی بات رہ جائے اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجئے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں۔ برف کے گالے بنا دیجئے جن میں انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات ان بزرگان قوم سے کہ یہ نوجوانوں پر اعتراض تو اب پرانا فیشن ہو گیا------ اور پرانی چیز کو دفن ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ بیشک آپ کو برا لگتا ہے اور آئندہ ادب ان موجودہ ادیبوں کو برا لگے گا سوت کسی کو اچھی نہیں لگتی۔

ان اصحاب کو کیونکر بھول جاؤں جو خود تو خوب لکھ چکے اور اب تائب ہو گئے ہیں۔ نصیحت پر تل گئے ہیں۔ ایک صاحب تو بہت ہی بگڑ گئے اور انہوں نے چند لاجواب اشعار بھی گنہگاروں کو راہ راست پر لانے کے لئے لکھے جن کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ مجھے بدقسمتی سے ان کا قافیہ اور ردیف اس وقت یاد نہیں آ رہا مگر معنی جو دل پر نقش ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ادیب جو ایسی فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان

کی بہن ماں نہیں۔ علاوہ شاعری حسن کے یہ ایک بالکل نرالا اور شاعرانہ گالی دینے کا مہذب طریقہ ہے اور مجھے ازحد خوشی ہوئی کہ اور باتوں میں پیچھے سہی لیکن اس ہنر میں ہم ہر ملک سے بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ ان حضرات سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں بہنیں نہ ہوتیں تو پھر مشاہدہ کہاں ہوتا؟ یہ ادب ہے گپ اور خرافات تو ہے نہیں کہ نشہ پی کر لکھ ڈالا۔ نیا ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے لئے ماڈل درکار ہیں۔ آخر؟ آپ کہیں گے۔ "شرم نہیں آتی!"

"جی سچ مچ کی تو نہیں آتی------ اگر آپ کہیں تو رعایتاً" شرمانے کو تیار ہیں۔"

اگر مصور شرمانا ہی شروع کر دیتے تو آج آپ کو آرٹ نظر نہ آتا اور پھر نئے ادیب آئینہ ساز ہیں' ہر شخص اس آئینہ میں منہ دیکھ کر شرما سکتا ہے۔

------ ہاں بس ایک بات اور ان اچھے فرمانبردار بچوں سے جو اخلاق اور تہذیب کے حامی اور ادب سے اسے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز نہ نیا ادب لکھیں اور نہ پڑھیں کیونکہ نیا ادب "اخلاق" اور "تہذیب" کی دھجیاں بکھیرتا ہے' یہ تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو بے خوف اور بے جگرے ہیں۔ جن کا ہاتھ بھی سڑ جائے تو اسے کاٹ کر پھینک سکتے ہیں کجا جھوٹی اور بناوٹی سوسائٹی------ جو اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اخباروں نے بائیکاٹ کر دیا یا ادیب روٹھ گئے------ اور وہ دن دور نہیں جب اس ادب کا ریزہ ریزہ لوگ پلکوں سے چن لیں گے۔ مؤرخین اکنومسٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع کر لیں گے۔ اگر یہ موجودہ ادب موجودہ زمانہ کی سچی تصویر ہے تو خود بخود عجائب خانہ کی زینت بن جائے گا اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو اپنے راستے لگ جائے گا------ ہمیں کیا فکر؟

ننھی سی جان

"تو آپا پھر اب کیا ہو گا؟"

"اللہ جانے کیا ہو گا۔ مجھے تو صبح سے ڈر لگ رہا ہے۔" نزہت نے کنگھی میں سے الجھے ہوئے بال نکال کر انگلی پر لپیٹنا شروع کیے۔ ذہنی انتشار سے اس کے ہاتھ کمزور ہو کر لرز رہے تھے اور بالوں کا گچھا پھسل جاتا تھا۔

"ابا سنیں گے تو بس اندھیر ہو جائے گا۔ خدا کرے انہیں معلوم نہ ہو۔ مجھے ان کے غصہ سے تو ڈر ہی لگتا ہے۔"

"تم سمجھتی ہو' یہ بات چھپی رہے گی۔ امی کو تو کل ہی شبہ ہوا تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ مگر وہ سودے کے دام دینے میں لگ گئیں اور شاید پھر بھول گئیں۔ اور آج تو-----"

"ہاں آپا۔ چھپنے والی تو بات نہیں۔ میں تو یہ کہتی ہوں جب رسولن کے ابا کو خبر ہو گی۔ تب کیا ہو گا؟ خدا قسم بھوت ہے وہ تو----- مار ہی ڈالے گا اس کو----- ہمیشہ ایسے ہی مارتا ہے کہ-----"

"اور اس نے کسی کو بتایا بھی تو نہیں۔ کیسی پکی ہے! پچھلی دفعہ جب دین محمد کا قصہ ہوا تو جب بھی چپکے سے خالہ کے ہاں بھاگ گئی----- بھائی جان دونوں کو نکالنے کو کہتے تھے-----" بال جمانے کے لئے وہ اوپر سے مہین دانے کی کنگھی پھیرنے لگی۔

"ہاں اور اس بیچارے کی اتنی سی تو تنخواہ ہے۔ بھیا جان پولیس میں دینے کو کہتے تھے اور دیکھ لینا اب کے وہ چھوڑنے والے نہیں۔ بس حد ہو گئی' معلوم ہے

ابا جان کا غصہ؟"

"تو آپا وہ پولیس میں دے دیں گے؟" سلمہ کی آواز بے قابو ہو گئی۔

"اور نہیں تو پھر کیا؟"

"ڈرنے کی بات ہی کیا ہے----- پولیس کسی کو نہیں چھوڑتی----- وہ تمہیں یاد ہے نتھو کی بہو نے ہنسلی چرائی تھی۔ تو دونوں گئے تھے جیل خانے۔"

"ہتھکڑیاں ڈال کر لے جاتے ہیں----- کیوں آپا؟"

"ہتھکڑیاں اور بیڑیاں۔"

"لوہے کی ہوتی ہیں نا۔"

"ہاں پکے فولادی لوہے کی۔"

"پھر کیسے اترتی ہوں گی۔ مر جاتے ہوں گے۔ تب ہی اترتی ہوں گی' کیا کرے گی بچاری رسولن۔"

"اور کیا بچاری----- بھئی مذاق تھوڑی ہے----- اور تم نے دیکھا اس نے گاڑا کس صفائی سے بچارے کو۔ ہمت تو دیکھو ہمیں بھی نہ بتایا۔ ارے اس نے تو کسی کو بتایا ہی نہیں۔"

"کیسی بے رحم ہے----- ہا----- بچارا بچہ----- اس کا جی بھی نہ دکھا----- ننھی سی جان۔"

"کیا مشکل سے جان نکلی ہو گی۔"

"مشکل سے کیا نکلی ہو گی۔ ایک انگلی کے اشارے سے بچارا ختم ہو گیا ہو گا۔"

"ذرا چلو اس سے پوچھیں کیسے مارا اس نے۔"

دونوں ڈری سہمی آنکھ بچاتی تلووں سے جوتیاں چپکائے گودام کی طرف چلیں۔ جہاں اناج کی گول کے پاس ٹاٹ پر رسولن پڑی ہوئی تھی۔ پاس ہی دو تین ننھی ننھی چوہیاں گرا پڑا اناج اور مرچ کے دانے لینے ڈری ڈری گھوم رہی تھیں۔ دونوں کو دیکھ کر ایسے بھاگیں جیسے وہ مار ہی تو دیتیں۔ حالانکہ آنے والیوں کے دل

چوہیوں سے بھی زیادہ بودے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ رسولن کے زرد چہرے اور پپڑائے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی رہیں۔ رسولن نوکرانی تھی پر وہ بچپن سے دوست ہی رہیں۔ اور ویسے تھوڑی بہت رسولن ہی مزے میں تھی، وہ پردہ نہیں کرتی تھی اور مزے سے دوپٹہ پھینک کر آم کے پیڑ تلے کودا کرتی۔ یہ دونوں جب سے ان کے ماموں رامپور سے آئے تھے پردہ میں رہتی تھیں اور گلاب ساگر والی نانی نے آکر سب کو موٹی کلف دار ململ کی اوڑھنیاں بنا دی تھیں۔ اور باہر قدم رکھنا جرم تھا۔ یہ رسولن ہی تھی جو ان پر رحم کھا کر دو چار کوئل ماری امیاں انہیں بھی کھڑکی سے دے دیتی تھی۔ جہاں وہ پر کٹے طوطوں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں اور ماموں کی مونچھ کی نوک بھی دکھ جائے تو وہ غڑاپ سے پیچھے کود پڑتی تھیں اور اب یہ رسولن پر بپتا پڑی تھی۔

"رسولن ----- اے رسولن ---- کیسا ہے جی؟"

"جی!" رسولن نے جیسے آہ کھینچ کر کہا۔ "اچھی ہی ہوں نزہت بی۔"

"کیا بخار تیز ہے ----- اور درد اب بھی ہے یا گیا۔"

"ہاں نزہت بی۔ سلمہ بی -----"

"ارے بھئی پھر کچھ کرنا۔ کہہ دے ماں سے کہ حکیم صاحب کے یہاں سے لا دے کوئی دوا -----"

"نہیں بی بی ----- مار ڈالے گی ماں تو ----- ویسے ہی غصہ رہتی ہے ----- اور اب تو اور بھی۔"

"ہا! غریب لڑکی! ----- مرتی ہو تو کوئی دوا لا کر نہ دے ----- حد ہے ظلم کی!" سلمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"مگر کب تک چھپائے گی ----- مٹی بھی تو ٹھیک سے نہیں ڈالی تو نے۔"

"کیا؟ تو کیا سب کو معلوم ہو گیا تھا!" رسولن اور بھی زرد پڑ گئی۔ اس کے سرمئی گال مٹی کے رنگ کے ہو گئے۔

"اب بس ہم سے مت بنو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ ہمیں کیا سب کو ہی

معلوم ہے۔"

"ہیں؟ ----- آپ کو ----- نزہت بی' آپ نے کہاں دیکھا۔" وہ لرز کر اٹھنے لگی۔

"اور کیا ہمیں کل ہی معلوم ہو گیا تھا اور ہم پچھواڑے جا کر دیکھ آئے' میں اور سلمہ گئے تھے -----"

"ہاں ----- ہم نے دیکھ لیا -----" سلمہ جلدی سے بولی کہ کہیں وہ پیچھے نہ رہ جائے اور رسولن سمجھے سب کچھ بس آپا ہی دیکھ سکتی ہیں۔

"شی اتنی زور سے نہ بولو -----" دونوں خود ہی ڈر کر سمٹنے لگیں۔

"ہم اور آپا کل گئے تھے شام کو۔ پھر ہم نے ڈھونڈا تو مہندی کے قریب ہمیں شبہ ہوا۔ پھر قمیص کا کونہ دکھائی دیا ----- جس کے چیتھڑوں میں لپیٹا ہے تو نے۔"

"ہاں دین محمد کی پھٹی ہوئی قمیص ----- اوہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ----- بچارے کی گردن یوں ----- ٹیڑھی ہو گئی تھی -----" نزہت نے ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح گردن اکڑائی۔

"پھر ----- پھر سلمہ بی ----- پھر آپ نے کہہ دیا ہو گا سب سے ----- ہائے میرے مالک! میری ماں! -----"

"ہم ایسے بچھورے نہیں ہیں رسولن ----- تیری شکایت کیسے کر دیتے ----- اور پھر جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ تو اکیلی ہی قصوروار نہیں ----- یہ دین محمد -----"

"اس بدذات کا میرے سامنے نام نہ لیجئے ----- بیوی -----"

"ہم تو کتنی دفعہ کہہ چکے تھے اس کتے سے نہ بولا کر ہمیشہ تجھے ذلیل کراتا ہے ----- مگر -----"

"اچھی بیوی اب مردوے سے بولوں تو رسولن نہیں' بھنگن کی جنی بس ----- تو اب آپ کہہ دیں گی سب سے اور جو سرکار کو معلوم ہو گیا تو خیر

نہیں- ہائے میرے اللہ ------ میں تو مر ہی جاؤں-----"

ایک تو اندھیرا اوپر سے نڈر چوہیاں پھر رسولن مرنے کی دھمکی دے- نزہت کی انگلیوں کے پورے ٹھنڈے پڑ گئے اور سلمہ کی آنکھوں میں مرچیں مچنے لگیں-

"کیسی باتیں کرتی ہے رسولن!" سلمہ کی ناک بھی جل اٹھی-

"کیا کروں بیوی' جی کرتا ہے اپنا گلا گھونٹ لوں-" اور وہ جی چھوڑ کر سبکیاں لینے لگی-

"ہیں' ہیں رسولن! کیا باتیں منہ سے نکالتی ہو' خدا سب کا مددگار ہے وہ ہی سب کی مصیبت دور کرتا ہے' مجھے تو اس نامراد دین محمد پر غصہ آ رہا ہے جیسے اس کا تو کچھ قصور نہیں-----" نزہت نے کہا-

"ہاں بھئی لڑکوں کو کون کچھ کہتا ہے- دین محمد کچھ بھی کر دے' بھائی جان حمایتی' ابا جان طرفدار' اور بچاری رسولن! خیال سے ہی میرا کلیجہ کٹا جاتا ہے- یاد ہے آپا پچھلی دفعہ کیسا غدر مچا تھا اور رسولن کی ماں بھی غریب کیا کرے- سچ کہتی ہیں امی لڑکیاں جنم سے کھوٹا نصیبا لے کر آتی ہیں-"

سلمہ کے گالوں پر سچ مچ آنسوؤں کی لکیریں بہنے لگیں- تینوں کے گلے بھر آئے اور نزہت کی ناک میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں' جانو کسی نے پانی چڑھا دیا ہو- تینوں چوہیاں بھی شاید بھول سے مرچ کا دانہ چبا گئیں' آنسو بھری غمگین آنکھوں سے' دور بیٹھی سبکیاں بھرا گیں- آنکھیں بھوری مونچھیں شدت اضطراب میں بھٹے کی بالوں کی طرح کانپ رہی تھیں-

"میری نزہت بی بتایئے اب میں کیا کروں- مجھے تو دادی بی کی پٹاری میں سے افیون لا دیجئے- سچ مچ کھا کر ہی سو رہوں-" رسولن نچلا ہونٹ کاٹنے لگی-

"ہیں رسولن خودکشی حرام ہے- اب تو بات معلوم ہوتا ہے دب دبا گئی اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا اور تو اچھی ہو جائے گی"----- سلمہ بولی-

"کیا کروں گی اچھی ہو کر- اس رات دن کی جوتیوں سے تو موت اچھی!"

"مگر میں پوچھتی ہوں----- یہ تو نے کیسے مارا----- اے ہے ذرا سا

تھا-----" نزہت کا آخر کو جی نہ مانا۔

"میں نے؟ بی بی آپ----- ہو ہو --- ہو --- ہو-----" رسولن بیمار کتیا کی طرح رونے لگی۔

"چپ رہو آپا تم اور غریب کا دل دکھا رہی ہو، چپ مت رو رسولن"----- سلمہ آگے کھسک آئی۔

"چلو امی آ رہی ہیں-----" نزہت اور سلمہ دروازے کے پیچھے دبک گئیں۔ امی لوٹا لئے نکلی چلی گئیں۔

"ٹھہرو بیوی کہو گی تو نہیں کسی سے-----" رسولن نے گڑگڑا کر سلمہ کے پائینچے کی گوٹ پکڑی۔

"نہیں----- ارے چھوڑ---- ارے-----" دونوں سکتہ میں رہ گئیں چوہیاں پپیوں کے پیچھے بھاگ گئیں۔"

"ہوں----- تو یہ معاملہ ہے! اچھا کہوں گا امی سے----- بھائی جان سنک میں کڑوا تیل لگانے گودام میں آئے تھے۔

"بھائی جان! انہوں نے ساری باتیں سن لیں۔ چپ رسولن۔ آپا چلو۔" دونوں دبک کر نکلنے لگیں، ایک نفرت سے بھائی جان کی ہاکی اسٹک کو گھورتی پرانے پلنگ کے بانوں میں بھاگ گئی۔

"کیا آپ ----- اچھا تو یہ کیئے سازشیں ہو رہی ہیں----- مگر میں نے سب سن لیا ہے۔ وہ دین محمد کی قمیض ----- مہندی کے نیچے----" بھائی جان تیل کی تلاش میں پیپے ٹٹولنے لگے۔

"تو----- آپ تو---- دیر سے کھڑے تھے---؟" سلمہ نے چاہا اس کے چہرے کی سفیدی آنچل میں جذب ہو سکے تو کیا کہنے!

"اور کیا----- برآمدے میں تھا میں----- اب تم پکڑی گئیں----- بتاؤ کیا سازش تھی؟"

"بھائی جان-----"

"کچھ نہیں سچ بتاؤ ورنہ ابھی امی سے جا کر کہتا ہوں----- بولو کیا بات ہے-----"

"اچھے بھائی جان---- دیکھئے غریب رسولن----- ہائے اللہ-----"

نزہت کا جی چاہا زور سے چنے کی گولی سے ماتھا پھوڑ ڈالے۔

"یہ رسولن----- سورنی ہے میرے سارے جوتے پلنگ کے نیچے بھر دیتی ہے' اس چڑیل کی تو کھال کھچوا دوں گا۔ ٹھہر جا----- کیا گاڑ کر آئی ہے----- شرطیکہ----"

"نہیں بھائی جان----- اچھا آپ قسم کھائیے کہ کہیں گے نہیں کسی سے"----- سلمہ نے بڑھ کر پیار سے بھائی جان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"ہنو---- نہیں کھاتے ہم قسم----- مت بتاؤ ہمیں ہم خود جانتے ہیں آج سے نہیں کئی دن سے-----"

"ہائے----- میرے مولیٰ----" رسولن اوندھی پڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھے آپ ہمارا ہی مرا منہ دیکھیں جو کسی سے کہیں----- سنئے ہم سب بتا دیں گے"----- دوسری طرف سے نزہت نے گلا دابا۔

"بات یہ ہے-----" اور کان میں سلمہ نے کھسر پسر کچھ بتانا شروع کیا۔

"بولے۔ "ارے-----! کب----" بھائی جان کی ناک پھڑکی اور بھویں ٹیڑھی میڑھی لہریں لینے لگیں۔

"کل شام کو-----" نزہت نے ہولے سے بتایا۔

"ابا جان کلب گئے تھے اور امی سو رہی تھیں----" سلمہ کے گلے میں سوکھا آٹا پھنسنے لگا۔

"ہوں----- پھر----- اب کیا انہیں پتہ نہیں چل جائے گا-----" بھائی جان دونوں کو جھٹک کر بولے۔

"مگر آپ---- آپ نہ کہئے گا----- آپ کو رضیہ آپا کی

قسم-----" سلمہ نے کہا۔

"رضیہ----- رضیہ----- ہیں! ہشت ہٹو----- ہم کسی کی قسمیں نہیں کھایا کرتے-----" اور وہ ہاتھ جھٹکتے چلے-----" ہم ضرور کہیں گے---- واہ ہٹو ہم جا رہے ہیں-----"

"آپا تم بھی کیا ہو----- اتنی زور زور سے بولتی ہو کہ سب انہوں نے سن لیا-----" بھائی جان کے جانے کے بعد تو سلمہ کی آنکھیں آنسوؤں میں غرق ہو گئیں۔ "یہ بھائی کسی کے نہیں ہوتے۔ سوئٹر بنوائیں' بٹن ٹکوائیں' وقت بے وقت انڈے تلوائیں' روپیہ ادھار لے جائیں اور کبھی بھول کر بھی واپس نہ کریں۔ کیا مسکین صورت بنا لیتے ہیں۔ جانو بڑی مصیبت پڑی ہے۔"

"نزہت گڑیا ذرا ایک روپیہ ادھار دے دو' سچ کہتا ہوں کل ایک کے بدلے دو دے دوں گا----- ہو نہ اور دگنے تو دگنے ذرا اصل ہی دے دیں تو بہت جانو"----- نزہت بالکل ہی بغاوت پر تل گئی۔

رسولن کی ماں روٹیوں کے لئے خشکی لینے آئی ہے۔ غریب کے سارے منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور چہرے پر نفرت و غصہ برس رہا تھا۔

"ارے رسولن کی ماں اس کا بخار نہیں اترتا۔ تم کچھ کرتی بھی نہیں-----" نزہت نے ڈانٹا۔

"ارے بیٹا کیا کروں----- حرام خور نے مجھے تو کہیں کا نہ رکھا۔ جہاں نوکری کی اسی کے گنوں سے نکالی گئی----- گھڑی بھر کو چین نہیں۔"

"مگر رسولن کی ماں تم چاہو کہ وہ مر جائے تو دیکھ لیا تم بھی نہیں چھوٹو گی ہاں اور کیا-----"

"مر جائے تو پاپ ہی نہ کٹ جائے' کلموہی نے مجھے منہ دکھانے کا نہ رکھا----- تھانے دارنی تو اب بھی مجھے رکھنے کو کہتی ہیں۔ پر اس کمینے کے مارے کہیں نہیں جاتی----- جب دیکھو مجھے تو نصیبوں کا رونا ہے----- جوان بیٹا چل دیا اور یہ ماری گئی رہ گئی میرے کلیجے پر مونگ دلنے کو-----"

"تو زہر دے دے نا مجھے --- ہو--- ہو --- ہو-----" رسولن نے بے بسی سے رو کر کہا۔

"ارے میں کیا دوں گی زہر' ان کرتوتوں سے دیکھ ۔لیجیو جیل جائے گی اور وہیں سڑ سڑ کے مرے گی۔ لو اندھیر خدا کا مجھ سے کہا تک نہ اس نے۔ ہٹو بی مجھے آٹا لینے دو۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں----- سلمہ----- نزہت! ہوں کتنی دفعہ کہا کہ شریف بیٹیاں رذالوں کے پاس نہیں اٹھتیں بیٹھتیں مگر نہیں سنتیں۔ جب دیکھو سر جوڑے باتیں ہو رہی ہیں۔ جب دیکھو دکھڑے روئے جا رہے ہیں----- چلو یہاں سے نکلو---- اوئی اسے ہوا کیا جو لاش بنی پڑی ہیں بنو!"

"جی----- جی---- بیوی جی بخار ہے کمبخت کو-----" رسولن کی ماں جلدی جلدی آٹا چھاننے لگی۔

"بخار تو نہیں معلوم ہوتا خاصہ طباق* سا چہرہ رکھا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ بنو-----"

"بیوی جی----- یہ دیکھئے یہ-----" دین محمد بیچ میں چلایا-----

"آپا---- وہ ---- وہ لے آیا ----" سلمہ نے جیسے قبر سے اکھڑی لاش کو دیکھ کر بزدلی سے گھگیانا شروع کر دیا اور نزہت سے لپٹ گئی۔

"ارے کیا ہے؟"

"یہ---- دیکھئے پچھواڑے مہندی کے تلے۔"

"ہے ہے---- کمبخت ---- اوئی----" اماں جان کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ پڑا' وہ مری ہوئی چوہیا تو دیکھ نہ سکتی تھیں-----

"یہ ---- یہ اس نے رسولن نے بیوی جی---- مہندی کے تلے گاڑا ----- یہ دیکھئے-----" رسولن کا جی چاہا وہ بھی ننھی سی چوہیا ہوتی اور سٹ* سے مٹکوں کے نیچے خلا میں جا چھپتی۔

"چلئے جھوٹے---- کیسا بن رہا ہے---- جیسے خود بڑا معصوم ہے۔"

----- نزہت چلائی۔

"تو کیا میں نے مارا ہے واہ صاحب واہ----- واہ نزہت بی' اور پھر اپنی ہی قمیص میں لپیٹ دیتا کہ جھٹ پکڑا جاؤں----- بیوی جی یہ رسولن نے گاڑا۔"

"چل نامراد تجھے کیسے معلوم میری بچی نے گاڑا ہے' تیری ماں بھینا نے گاڑا ہو گا لو! اور میری لونڈیا کے سر تھوپ رہا ہے' اس کا جی پرسوں سے اچھا نہیں ہے الگ پڑی ہے کوٹھڑی میں" رسولن کی ماں دھاڑی اور زور زور سے چھلنی سے آٹا اڑانے لگی' تاکہ سب کے دم گھٹ جائیں اور بھاگ کھڑے ہوں۔ وہ اپنی پیٹھ سے رسولن کو چھپائے رہی۔ کہتے ہیں دائی نے اس کے گلے میں بانس گھنگول دیا تھا۔ جبھی تو ایسا چیختی تھی۔ محلہ کی زیادہ تر لڑائیاں وہ صرف اپنے گلے کے زور سے جیت جایا کرتی تھی۔

"سرکار میں شرط بدتا ہوں۔ اسی کا کام ہے یہ----- یہ دیکھئے میری قمیض بھی چرا کر پھاڑ ڈالی' جانے دوسری آستین کہاں گئی۔"----- دین محمد بولا۔

"حرامخور اسی کا نام لئے جاتا ہے' کہہ دیا پرسوں سے تو وہ پڑی مر رہی ہے۔ مرغیاں بھی میں نے بند کیں اور اپنے ہاتھ سے گودام کی جھاڑو نکالی۔ مؤا کام ہے کہ دم کو لگا ہے-----" رسولن----- یاں جھوٹ سچ اڑانے لگی۔

"اسی لئے تو مکر کئے پڑی ہے ڈر کے مارے' ورنہ ہمیں کیا معلوم نہیں----- اس کا مرض' چپکے سے گاڑ آئی کہ سرکار کو معلوم ہو گیا تو جان کی خیر نہیں۔" بیوی جی جوتیوں سے پانی ٹپکانے لگیں۔ "اس چڑیل سے تو میں تنگ آ گئی ہوں۔ رسولن کی ماں یہ کیڑوں بھرا کباب میں گھڑی بھر نہیں رکھنے کی۔ لو بھلا غضب خدا کا ہے کہ نہیں۔"

"سور کہیں کا----- یہ دین محمد-----" سلمہ بڑبڑائی۔

سلمہ نہ جانے کیا بڑبڑائی کہ اماں جان نے ڈانٹ بتائی۔

"بس بی بس تم نہ بولو کہہ دیا کنواریاں ہر بات میں ٹانگ نہیں اڑایا کرتیں----- چلو یہاں سے تمہارا کچھ بیچ نہیں----- رسولن کی ماں بس آج

ہی اسے اس کی خالہ کے یہاں پہنچا' کتنا کہا' حرامخور کا بیاہ کر دے کہ پاپ کٹے۔"
بیوی جی بری طرح طعنے دینے لگیں۔

"کہاں کر دوں بیوی جی' آپ ہی تو کہتی ہیں کہ چھوٹی ہے' سرکار کہتے ہیں ابھی نہ کر جیل ہو جائے گی اور میں تو موئی کی کر دوں کوئی قبولے بھی' مجھے تو اس نے کہیں منہ دکھانے کا نہیں رکھا۔" رسولن کی ماں رو رو کر چھلنی جھاڑنے لگی۔

"اری اور یہ مرا کیسے۔ رسولن ذرا سی جان کو تو نے مسل کر رکھ دیا اور تیرا کلیجہ نہ دکھا۔"

"او نہ او نہ او نہ-----" بچاری رسولن کچھ بھی نہ بتا سکی۔

"بن رہی ہے بیوی----- بڑی ننھی سی ہے نا-----" دین محمد پھر ٹپکا۔

"اوں اوں اللہ قسم بیوی جی----- یہ----- یہ دین محمد۔"

"لگا دے میرے سر----- اللہ قسم بیوی جی یہ اسی کی حرکت ہے----- جھوٹی-----"

"خدا کی مار تجھ پر' جھاڑو پیٹے ایک سال' میری لونڈیا کا نام لئے جاتا ہے۔ بڑا ساہوکار کا جنا آیا وہاں سے' ہر وقت میری لونڈیا کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔"----- رسولن کی ماں اپنی مخصوص چنگھاڑ میں پھٹ پڑی۔

"بس بس جب تک بولتی نہیں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں----- تمہاری لونڈیا ہے بھی بڑی سیدانی-----"

"دیکھو دین محمد کی ماں' تمہارا کوئی بیچ میں نہیں۔ زمانہ بھر کا لچا مُوا-----"

"بیچ کیسے نہیں اور تمہاری لونڈیا----- ابھی جو دھر کے سارے پول کھول دوں تو بغلیں جھانکتی پھرو' کہو کہ نوکر ہو کر نوکر کو اگاڑتی ہیں-----" رسولن کی ماں چنگھاڑ سکتی تھی تو دین محمد کی ماں کی نحیف مگر ایک لے کی آواز کانوں میں مسلسل پانی کی دھار کی طرح گر کر پتھر تک کو گھس ڈالتی تھی۔ چیں چیں چیں جب شروع ہوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا' دنیا ایک پرانا چرخہ بن گئی ہے۔ جس میں کبھی تیل نہیں

دیا جاتا۔

"آیا نگوڑا مارا کہیں سے-----" رسولن کی ماں دب نہیں رہی تھی۔ ذرا یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔ "اور کیا ننھی بن کر میرے لونڈے کا نام لے رہی ہے جیسے ہم سے کچھ چھپا ہے۔ پچھلے جاڑوں میں بھی اسی نے ایسے ہی جھٹ پٹ کر دیا اور کانوں کان خبر نہ ہوئی اور تم خود چھپا گئیں۔ میرا لڑکا موی پر تھوکتا بھی نہیں۔"

"دیکھئے بیوی جی اب یہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ موئی قصائن کہیں کی مارا چلو، اچھے چٹ پٹ کیا کوئی تمہارے خصم کا تھا-----"

"میرے تو نہیں ہاں تمہارے خصم کا تھا جو پوٹلی باندھ اندھ کنوئیں میں جھونک آئیں اور لونڈیا کو جھٹ سے خالہ کے بھیج دیا۔ ذرا سی فتنی اور گن تو دیکھو"----- دین محمد کی ماں کی آواز لہرائی۔

"بس جی بس یہ کنجر خانہ نہیں----- نہ تمہار خصم کا نہ ان کے خصم کا، چلو اپنا اپنا کام کرو----- بھلا بتلاؤ سرکار کو پتا چلا تو----- اللہ جانتا ہے، قیامت رکھی سمجھو----- ٹانگ برابر کی چھوکری کیا مزے سے مار مور ٹھکانے لگا دیا اور تھوپ بھی آئی----- اندھیر ہے کہ نہیں----- اے ہے چل ہٹ ادھر"----- بیوی جی جلدی سے لپکیں۔

"کچھ نہیں ابا میاں یہ رسولن-----" بھائی جان ہاکی اسٹک پر اب تک تیل مل رہے تھے۔

"اے چپ بھی رہ لڑکے، کچہری سے چلے آتے ہیں آتے ہی جھلا جائیں گے۔"

"یہ دیکھئے سرکار----- یہ مار کر پچھواڑے گاڑ آئی----- میں نے آج دیکھا-----"

"ارے!!! ----- ادھر لانا----- افوہ----- یہ کس نے----- مارا"

"سرکار رسولن نے----- وہ اندر بنی ہوئی پڑی ہے۔"

"او مردے کیوں جھوٹے بہتان جوڑتا ہے، بجلی گرے تیری جان پر-----" رسولن کی ماں دانت پیستی جھپٹی۔

"مردی ہو گی تیری چھیتی جس کے یہ کرتوت ہیں----- لاڈو کے گن تو دیکھو-----"

"چپ رہو کیا بھٹیاریوں کی طرح چیخ رہی ہو-----" سرکاا ب رعب سے غرائے اور سارے میں سناٹا چھا گیا-----"ابھی پتہ چلا جاتا ہے۔ بلاؤ رسولن کو۔"

"سرکار----- حضور!-----" رسولن کی ماں لرزنے لگی۔

"بلاؤ----- باہر نکالو سب معلوم ہو جائے گا۔"

"سرکار، جی اچھا نہیں نگوڑی کا-----" بیوی جی انھیں حمایت کرنے۔"

"جی وی سب اچھا ہے----- بلاؤ اسے-----"

"رسولن، او رسولن----- چل باہر سرکار بلاتے ہیں۔" دین محمد داروغہ کی طرح چلایا۔

رسولن گھٹی گھٹی آہیں بھرنے لگی۔ چیخیں روکنے میں اس کے ہونٹ پڑپڑ بولنے لگے مگر حکم حاکم مرگ مفاجات، کراہتی سسکتی لڑکھڑاتی جیسے اب گر کر جان دی۔ نزہت نے لپک کر سہارا دیا----- بخار سے پنڈا تپ رہا تھا اور منہ پر نام کو خون نہیں!

"بن رہی ہے سرکار" دین محمد اب بھی نہ پسیجا!

"ارے ادھر آ----- ادھر، ہاں بتا----- صاف صاف بتا دے ورنہ بس-----"

"پولیس میں دے دیں گے سرکار-----" دین محمد ٹپکا----- اور رسولن کی ماں نے ایک دوہتڑ اس کی جھکی ہوئی کمر پر لگایا کہ اوندھے منہ گرا سرکار کے پاس!

"جو انا مرگ تجھے ہیضہ سمیٹے-----" رسولن کی ٹانگیں لرز رہی

تھیں----اور منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"ہاں صاف بتا دے ورنہ سچ کہتے ہیں ہم پولیس میں دے دیں گے----" سرکار بولے۔

"ہچکیوں کی وجہ سے رسولن بول بھی نہ سکی-----" رسولن کی ہچکی بندھ گئی۔

"بیگم اسے پانی دو----ہاں اب بتا----کیسے مارا----"

"پانی پی کر جی تھما ذرا' بڑی دیر تک پانی چڑھاتی رہی کہ جواب سے بچی رہے۔

"ہاں بتا----جلدی بتا----" سب نے کہا۔

"سرکار----"

"ہاں بتا----"

"سرکار---ا-نہہ---ا-نہہ---ہو ہو---میں-----میں میرے سرکار میں ڈربہ-----فر-----ڈربہ بند کر رہی تھی-----تو کالی مرغی بھاگی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بھیڑا-----تو-----تو یہ پچ گیا-----اوہ اوہ۔"

"سرکار بالکل جھوٹ یہ ایسی بری طرح مرغیوں کو ہکاتی ہے کہ کیا بتائے۔" دین محمد کہاں مانتا تھا۔ "منع کرتا ہوں کہ ہولے ہولے۔"

"چہ چہ چہ' کیا خوبصورت بچہ تھا۔ منارکہ کا تھا۔ ابھی آپ نے کانپور سے منگوایا تھا-----ہاک۔ آج اسے رسولن کو کھانا مت دینا۔ یہی سزا ہے اس چڑیل کی-----اور دین محمد' آج سے مرغیاں تو بند کیا کر' سنا۔"

"واہ واہ واہ نگوڑی میری لونڈیا کو ہلکان کر دیا۔ صدقے کیا تھا نگوڑا بوٹی کا تکہ' ذرا سا مرغی کا بچہ اور اتنا شور' چل ری چل۔ آج ہی مردار کو خالہ کے گھر ٹپکوں' ایسی جگہ جھونکوں (دھپ! ٹیں' رسولن کی آواز) کہ یاد ہی کرے' اجیرن کر دی میری زندگی-----منہ کالا کروا دیا-----"

رسولن کی سسکیاں اور ماں کے کوسنے عرصہ دراز تک ہوا میں رقصاں
رہے۔
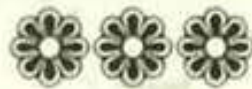
نفرت

اسے تو اسی دن سے اس سے نفرت ہو گئی تھی جس دن ممانی رات بھر چیخی تھی اور صبح چار بجے وہ پیدا ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ بچی ہسپتال کی میم صاحب دے گئی تھیں مگر وہ ان بہلاوں میں ذرا کم آتا تھا اور ہسپتال کی میم صاحب جلے کنڈے کی شکل کی چمگادڑ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اتنی لال کتر بچی لا ہی نہیں سکتی تھی۔

مگر یہ بچی اسے بہت ہی بری لگی گندی اور نرم' اس نے کرتا اٹھا کر اس کا نال دیکھا اور اس کا جی متلانے لگا۔

"ہینخ تھو!" وہ منہ بناتا ممانی کے پلنگ سے اتر آیا اور جب اس بچی کا سر منڈا تو وہ بالکل گنجے قصائی کی شکل کی لگنے لگی۔ جھریوں دار منہ' بگلی خالہ جیسا اور ذرا سا پیٹ چھو دو تو مکوڑے کی طرح ہاتھ پھیلا کر ہوا کو نوچنے لگتی۔

اور پھر وہ موٹی ہونی شروع ہوئی اور ممانی سوکھنے لگی۔ صبح شام وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر دہائی دیتی رہتی اور جب تک ممانی اسے دوپٹے میں چھپائے دودھ نگلایا کرتی۔ وہ چپ رہتی۔ یا تار کے بنے ہوئے پنگوڑے میں ٹانگیں چوکھونٹی کئے سوئی رہتی۔ اس کے یہی گن دیکھ کر شاید اس کی ماں اسے اپنی بہو بنانے پر تیار ہو گئی تھی۔

"میرے منو کی دلہن' میری لاڈو۔" اماں اسے لے کر گھٹنوں پر ہلاتی اور وہ اپنی گھورتی ہوئی آنکھوں کو ٹھہرا کر کاٹھ کے الو کی طرح تکتی اور منو پر بغاوت طاری ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا کوئی اس گوشت کے لوتھڑے کو چیل چلور کر دے۔ کوؤں کو کھلا دے۔ اس نے ایک نہیں ہزار دلہنیں دیکھی تھیں۔ پر اتنی ذلیل دلہن کاہے

کو دیکھی ہو گی۔ رال تھی کہ اس کے منہ سے نالی کی طرح بہے جاتی اور سارے دالان میں پوتڑے تکونیاں پھیلی مہکا کرتیں۔ گھنٹوں بھنگن اس کے اعمال دھوتی اور منو کو بھنگن کے لئے نل کھولنا پڑتا۔ وہ منہ بناتا' بسورتا ناک موڑے جا کر نل کھول کر اداس لوٹ آتا۔

اس بچی کے خلاف اس کے دل میں بغاوت بڑھتی ہی گئی' کمبخت بیمار بھی تو نہ ہوتی۔ منو کا جی چاہتا اسے نمونیا ہو یا چیچک نکلے اور وہ مرے یا کم از کم اپاہج ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا۔ اس کا موٹا سا دودھ بھرا پیٹ پھاڑ ڈالے کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ بڑا سا پتھر اٹھا کر چپکے چپکے جائے اور دھم سے اس پر پٹخ مارے مگر عین وقت پر یا تو کوئی ادھر آ جاتا یا وہ خود ہی بھاگ کر چلانے لگتی یا پتھر بھاری ہوتا۔ ایک دن اس نے اس پر برآمدے میں کھڑا ہوا پلنگ گرانے کی ٹھانی' وہ چپکے سے پلنگ کے پیچھے گیا اور بڑے تاک کے سوچا ایک ہی دھکا میں اسے اس کے پنگوڑے پر الٹ دے مگر پھر عین وقت پر بچی کی ناک میں مکھیوں نے پر ڈال کر جگا دیا اور وہ زور سے چھینکی اور منو لرز کر پلنگ کے پیچھے سے بھاگا۔ ارے بڑی چالاک تھی وہ!

اور پھر وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس نے وبا کی طرح ہر وقت گھر میں رینگنا شروع کیا۔ کبھی زمین پر اوندھی لیٹ کر مٹی چاٹتی کبھی جوتیاں اٹھا کر چوڑتی اور کبھی کتے کی کونڈیلی میں منہ لگا کر پانی پینے لگتی۔ برسات میں تو بس ذرا سا پانی پڑا اور وہ چھمک کر رینگی - ہر پانی کے ننھے سے گڑھے میں چھپا چھپ اپنا موٹا ہاتھ پھیلا کر مارتی اور ساری کیچڑ منہ پر مل لیتی اور ہی ہی ہنستی۔

"اے منو بھیا ذرا اسے ہٹا تو دے وہاں سے۔"

ہونہ! منو اور اس کتیا کو چھوئے' وہ خاموش غرور سے اپنی کتاب پر نظر جمائے اکڑا بیٹھا رہتا۔

"میرا بھیا کیسا۔ سردی لگ جائے گی موئی کو۔۔۔۔ ذرا اٹھا لا۔" ممانی گڑگڑاتی۔

"اے اٹھتا ہے کاہل مٹس کہ نہیں۔۔۔۔" اس کی اماں چلاتی اور جل

بھن کر اس کے کباب بن جاتے' وہ کتاب پٹخ کر اٹھتا۔ جی چاہتا اسے اٹھا کر اسی گڑھے میں گڑو دے۔ مگر خیر وہ اسے گندی مینڈ کی طرح اٹھاتا۔

"اسے تو یہاں کہاں میری صورت پر لئے آتا ہے۔ بھیا ذرا انل کے پاس لے جاکر دھلا دے-----"

نل کے پاس لے جانے کے بجائے وہ چاہتا اسے کسی گہرے تلاؤ میں ڈال دے مگر مجبورا" وہ خاموشی سے اسے نل کے پاس لے جاتا۔ اب وہ مچل جاتی۔ نل کی دھار پکڑتی۔ کبھی چھینٹیں اڑاتی' کبھی کچھ کرتی اور اسے اٹھانے کے بعد منو خود کیچڑ میں لتھڑ جاتا۔

"اے ہے کپڑے تو دیکھ اپنے----- کیا ناس لگایا ہے اجلے کرتے کا"----- الٹا اسی پر الزام تھوپ دیا جاتا' وہ کم سخن تھا اس لئے صرف پیر پٹختا چل دیتا۔

پھر وہ اور بڑھی اور خاصی بلائے جان ہو گئی۔ لوگوں نے اس کا نام فخر النساء رکھا! مگر وہ اپنی جنس کے لئے اسی طرح باعث شرم رہی۔ ذلیل ست' کام چور' یا تو جھولا جھول رہی ہے یا ہجولیوں کے ساتھ اوڑھنی کا برقعہ بنائے عورتوں کے پکے پکے کھیل کھیل رہی ہے۔ اگر کبھی وہ ادھر سے گزرتا تو وہ شرما کر لڑنے لگتی۔ دنیا جہان کی لڑکیاں شرما کر سر جھکایا کرتی ہیں۔ پر وہ جبڑا پھیلا کر کڑک مرغی کی سی آواز نکالتی اور بھتنی کی طرح منمناتی۔

"ایں----- جاؤ منو بھیا ہم اماں سے کہہ دیں گے-----" جیسے وہ اسے اور اس کی چڑیل دوستوں کو تاکنے آیا تھا----- وہ غرور سے ایک طرف گردن اکڑا کر چلا جاتا۔

"ہماری گڑیا کا بیاہ ہے ہمیں دھنک لا دو-----" وہ حکم چلاتی۔

"کیسی دھنک؟...... کیسی دھنک؟" وہ بیوقوفوں کی طرح غصہ ہوتا۔

"ایلو منو بھیا دھنک نہیں جانتے.... ہی ہی ہی....." وہ کمینی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی۔ "اے وہی دو پیسے کی دھنک۔"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔" وہ منہ پھیر لیتا۔

"اوں...... بھیا کیسے' لا دو نا-----" اور منو کو غصہ چڑھتا۔ وہ کمزوری سی محسوس کرتا۔

"ارے تو کیسی دھنک بتا بھی کچھ......"

"لو' تم بس یہ دوپٹہ دکھا دینا دکاندار کو اور کہنا دو پیسے کی دیدے-----"

ہونہہ تو وہ یہ لال ٹول کا دوپٹہ جیب میں رکھ کر لے جائے۔ وہ دوپٹہ جسے وہ جوتوں کے پونچھنے کے لئے بھی میلا سمجھتا ہو۔ وہ نفرت سے دوپٹہ جھٹک دیتا۔

"مر ہی جاؤ اللہ کرے----- آں لے کے پھینک بھی دیا۔" وہ موٹے موٹے گال اور پھلا لیتی۔ مگر وہ دو پیسے کی دھنک لا دیتا۔ کیا کرتا اور؟ اور نہایت بے رخی سے ماتھے پر شکنیں ڈالے وہ اسے دھنک دے دیتا۔

"دیکھو جی فخرن کو کوسا پیٹا نہ کرو جلاہیوں کی طرح----- لو----- بس۔" اور وہ دھنک لے کر نہایت خود غرضی سے ٹھنسے لگاتی چل دیتی۔ کسی کا احسان ماننا تو اس کی گھٹی ہی میں نہ پڑا تھا۔ خود غرض کہیں کی۔ ہمیشہ کی خود غرض تھی۔ اس کی خود غرضی ہی سے منو جلتا تھا۔

لیکن جب اس کے بھائی اس کو ٹھیک کرنے پر اتر آتے تو منو کو مزا آ جاتا۔ رفیق اس کا گھروندا بگاڑ دیتا اور ساجد اس کی مٹی کی کلیاں پھوڑ دیتا۔

"آؤ منو فخرن کی گڑیاں جلائیں-----" منو کا جی کھل اٹھتا اور دونوں مل کر ٹین کی صندوقچی میں سے میلے کچیلے چیتھڑے نکال کر مٹی کا تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ جب فخرن کو معلوم ہوا تو وہ ایسے چیختی گویا وہ رانڈ ہو گئی یا اس کے جوان بیٹے مر گئے۔

"اللہ کرے کیڑے پڑیں...... ہیضہ ہوئے' طاعون لے جائے۔ مگر وہ منڈیروں پر چڑھے فتح مندی سے مسکرایا کرتے۔ ذرا جو پروا کر جائیں۔

"اللہ کرے کھڑے کھڑے دم نکل جائے...... آدھی رات کو جنازہ جائے۔"

"کتے لاش نوچیں!" اب یہ حد تھی۔ چڑیل کو کوسنے کتنے بھیانک آتے تھے۔

"کفن نہ نصیب ہو، قبر میں بجو کھائیں......" منو کو اور اس سے نفرت ہو جاتی اور ساجد حقارت سے مسکرانے کی کوشش کرتا۔

"کوڑھ پھوٹے......" منو کو پھریریاں آنے لگتیں اور ساجد کی بھویں تن جاتیں۔

"آنکھیں پٹم ہو جائیں......" فخرن کی لغت بڑھتی ہی جاتی اور منو اور ساجد کی طبیعت زیادہ مکدر ہوتی جاتی۔ وہ خود پر ترس کھانے لگتے اور کچھ شکست سی کھانے لگتے۔

"اری او فخرن کی بچی چھپے گی کہ لگاؤں آ کے جوتیاں۔ لوکو سے ہی چلی جاتی ہیں لاڈو۔ صدقے کروں ایسی لونڈیا کو-----" اور وہ دانت پیستی برابر چپکے چپکے کوستی رہتی۔ یہاں تک کہ ممانی اسے مارنے اٹھتی۔ ایسے موقعوں پر منو کی اماں ضرور دخل دیتی۔

"اے دلہن کھائے لیتی ہو لونڈیا کو۔ موئے لڑکوں کو نہیں دیکھتیں، لے کے اس کی گڑیاں جلا دیں مارے گیوں نے...... تو میری بنو! میں تجھے اور بنا دوں گی اور فوراً بقچیا نکال کر الٹے سیدھے چیتھڑے نکلنے لگتے۔ فخرن آنسو پونچھ کر پاس جا بیٹھتی۔

جوں جوں گڑیا بنتی جاتی فخرن میں جان پڑتی جاتی اور منو کا خون کھولتا جاتا۔ اماں نے تو بس لاڈ میں اسے پیدا ہوتے ہی خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ خیر دیکھنا ہے کہ وہ کہاں تک جاتی ہیں۔ منو نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اب کے انہوں نے بہو بنانے کی دھمکی دی تو ساری گڑیاں تو الگ رہیں اس کی سرخ مخمل کی جوتیوں اور گلابی کریب کی اوڑھنی کی خیر نہ سمجھو! بس پچھواڑے گنڈی کی کیچڑ میں کوئی تار ملے تو ملے۔

اور پھر پھند کی مسلمانیوں میں جا رہی تھی ٹیکا لگائے، بقچہ بی، چلتے چلتے زبان نکال کر "ای ای" کرتی پھدک کر ڈولی میں بیٹھ گئی۔

"اماں اس نے منہ کیسے چڑایا----- مار کے رہوں گا سوریا کو...... وہ ڈولی کا پردہ پکڑ کر اڑ گیا۔

"لڑکے ہوش میں، کب چڑایا اس نے تیرا منہ، واہ-----! چپکی میرے ساتھ آئی ہے...." اماں نے حمایت لی اور وہ پھولے پھولے گالوں پر بھولپن لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ابھی چڑایا تھا اس نے..... ماروں گا میں اسے۔"

"اے چل ادھر، آیا بڑا مارنے والا----- اٹھاؤ جی کہارو ڈولی----- اور پھر ایک دفعہ ناک سکیڑ کر اس نے ڈولی اٹھتے اٹھتے منہ چڑا دیا۔ اماں نے دیکھا مگر پیار سے اس کی تھوتھنی پکڑ کر ہنس دیں۔ ڈولی چلی گئی مگر منو شام تک جلتا رہا۔

پھر اس سے ہر وقت لڑائی ہوتی۔ سارے گھر کی لڑائی ہوتی، ساجد سے زبان چلاتی۔ رفیق کو کوستی، محمود کو کھسوٹتی اور منو کا منہ چڑاتی، منو کا بس چلتا تو اینٹا لے کر اس کا منہ اتنا کچلتا کہ ہونٹ آٹا ہو جاتے، دانت جھڑ جاتے اور پھولے ہوئے گال خونم خون ہو جاتے۔ مگر اماں کہتی تھیں۔ "خبردار جو لڑکی پہ ہاتھ اٹھایا۔ کیا سمجھا ہے، ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی!" خیر ہاتھ تو وہ کیا توڑ سکتی تھیں کسی کے، چوہیا کا پنجہ بھی نہ مروڑ سکیں، سوکھی ماری کھانستی ہوئی اماں مگر غرور پہلوانوں جیسا! اور اس غرور کے سائے میں فخرن کوڑی کام کی نہیں رہی۔

"میں منو بھیا سے بیاہ نہیں کروں گی، اتنے سوکھے مارے پودنے جیسے ہیں-----" وہ منہ اترا کر کہتی۔

"چپ چڑیل لڑکیاں نہیں بولا کرتیں"----- ممانی ہنس کر ڈانٹتی۔

"واہ تو کیوں کروں ان سے، پھوپی اماں میں تو سجو بھیا سے بھی نہیں کروں گی، وہ کالے ہیں، دوسرے میری گڑیا کا دوپٹہ چراتے ہیں، نہ میں رفیق بھائی جان سے کروں----- نا بھیا میں تو کسی سے بھی نہ کروں۔ سب برے۔ رفیق بھائی جان کی اتنی لمبی ناک، ہی ہی ہی۔" اور سب ہنستے مگر منو کا جی چاہتا کہ لکڑی ہو مضبوط سی اور یہ لڑکی! گویا وہ سب تو اس کتیا سے شادی کرنے کو مر رہے تھے نا۔

"اری تو پھر کس سے کرے گی-----" اماں اسے چڑاتیں۔

"میں تو صوفی سے کروں گی----- ہاں بھیا!" وہ اپنے سگے چھ مہینہ کے

بھائی سے ناجائز رشتہ کرنے کو تیار ہو جاتی اور منو کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اٹھتا۔

"منو بھیا کی دلہن------ اے منو بھیا تمہاری دلہن کہاں ہے۔" جب سے وہ ایک شادی میں گئی تھی۔ ہر وقت دلہنوں کا ذکر کرتی۔

"بھاگو یہاں سے۔" منو نفرت سے بولا۔

"اوں تو بتاتے کیوں نہیں------ کیا کنوارے ہی بیٹھے رہو گے سداں------" وہ بوڑھیوں کی طرح ہتھیلی پر گال رکھ کر کہتی۔

"جاتی ہو کہ نہیں---- اماں دیکھو یہ فخرن نہیں مانتی' پھر میں مار دوں گا اسے۔

"بس ہاتھ ہی چلتا رہتا ہے---- کر کیا رہی ہے تیرا' وہ چپکی تو بیٹھی ہے۔"

"میں پوچھ رہی ہوں پھوپی اماں کہ تمہاری دلہن کہاں ہے۔" اور ساری عورتیں ہنسنے لگیں۔

اری آئینہ میں جا کے دیکھ منو کی دلہن کو۔" اور منو کے چنگاریاں لگیں۔

"ارے اس میں تو میں ہی ہوں..... آں میں کیوں ہوتی ان کی دلہن----" وہ اتراتی ہوئی آئینہ دیکھنے لگی۔ اتنے میں منو کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا اور وہ چلتا اٹھ کر!

"میں کیوں ہوتی' بھنگن ہو گی ان کی دلہن۔ کالی کلوٹی بھنگن۔" منو کا دل چاہتا لوٹ کر اس کا ہاتھ مروڑ کر آئینہ چھین لے اور لگائے دو گھونسے کس کس کر مگر وہ نہایت استقلال سے سینہ پھیلائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ دنیا میں کوئی غم ایسا اس لڑکی کو لگ جائے کہ بس روتے ہی کٹے۔ کوئی فکر' کوئی غم جو اس کی جان کو چمٹ جائے مگر بس اس کا دل ناحق اداس ہوتا اور الٹی اسی کی جان کو فکریں لگ جاتیں۔ اسے کتنی خوشی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ اب اور لوگوں کو بھی فخرن کی یہ نجار جیسی زندگی شاق گزرنے لگی تھی۔ اسے بھی اب عربی کا قاعدہ شروع کرایا گیا اور کمر بند اور

جھاڑنوں کے کنارے بخیہ کرنے کو دیئے گئے۔ کیسا مزا آتا۔ جب اسے وہ دو حرفی لفظ ہزار بار رٹنے پر بھی یاد نہ ہوتا اور ملانی جی اس کی کمر میں دھموکے لگاتیں اور اس کی اوڑھنی آنسوؤں اور ناک کے پانی سے لتھڑ جاتی۔ کمر بند سینے میں اس کا ٹکوا نہ لگتا تب نانی اماں اس کی موٹی رانوں میں سوئی چبھو دیتیں۔

"دیکھ تو کیسا سیا ہے اپنا کفن۔"

اور منو کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگتیں۔ کمر بند کا کفن! اس کا جی ترس کھانے کو چاہتا مگر وہ دل کی پھیلتی ہوئی مسرت کے آگے اس پاک جذبے کو کمزور پاتا۔ جان بوجھ کر اس کے جوتیاں لگوانے کو وہ اپنے زین کے نیکر کھدر کی شیروانی اور ایسے ہی سخت کپڑوں میں رفو کرنے کیلئے اسے دیتا۔

"چلو فخرن' یہ بٹن ٹانکو۔۔۔۔" وہ جان کر ایسا کہتا کہ وہ چڑ جائے۔

"نہیں ٹانکتے کوئی تمہارے باپ کے نوکر ہیں۔"

"دیکھو ممانی بی' یہ نہیں کرتی میرا ذرا سا کام بھی۔ کہتی ہے باپ کی نوکر نہیں۔"

"او فخرن کی بچی چل ادھر۔۔۔ لو ٹانکے گی کیسے نہیں......" اور وہ تھوتھنا پھلا کر بیٹھ جاتی۔

"کہتی تھی باپ کی نوکر نہیں......" وہ ممانی کو یاد دلاتا۔

"ہوں' اب باپ دادا بھی لینے لگیں بیگم صاحبہ...... ممانی دانت پیستی اور ایک گھونسہ گھم سے پڑتا۔ گھونسوں سے منو کا دل کب بھرتا تھا' کاش کوئی اس کی صلاح مانتا تو ایک لوہے کی مضبوط سی موگری بنوالی جاتی تاکہ کچھ معلوم بھی ہوتا کہ ہاں کچھ مار پڑی۔ ورنہ اس کی پر گوشت پیٹھ پر ایسا ویسا گھونسہ تو بس جیسے مکھی نے لات مار دی۔

اور اگر ذرا ابھی کوئی کام بگاڑ دیتی تو سب کے سب پیچھے پڑ جاتے۔

"ذرا چائے سونگھو' ساری لہسن کی بو ہے۔" ساجد اپنی پکوڑا جیسی ناک سکیڑتا۔

"اونہوں...... یہ انڈوں میں نمک کس گدھے نے ڈالا ہے۔" رفیق بولتے

"اور بھنڈی بھی نہیں گلی کوئی اور کہتا۔

"آخر یہ پھر ہے کس کرم کی.... بس کھانے کو دے دو دس سیر۔"

"بھن بھن کرتی وہ کام کرتی رہتی اور چپکے چپکے سب کے طعنوں کے جواب دیتی۔

"آخر ہم کیوں کریں واہ بلے دے کے جو کام ہے ہماری جان پر۔"

"ہاں بس تو تو تخت پر چڑھی بیٹھی رہے...... ممانی چلاتیں اور پھر خالہ اور نانی غرض چاروں طرف سے لے دے ہونے لگتی اور منو کا جی خوش ہو جاتا۔

جب وہ اسکول جانے لگی تو اور اینٹھی' جب دیکھو مس ٹامس مس جرمی' جب دیکھو سڑی سڑی کورس کی کتابیں' موزے ٹوپی ٹیڑھے ٹیڑھے بنے جا رہے ہیں۔ سارے گھر کو اور بھی چائے میں لہسن کی بو اور انڈوں میں تیز نمک اور کچی بھنڈیاں ستانے لگیں مگر اب وہ اسکول کے کام کی دھمکیاں دیتی۔

"کچھ کام وام نہیں...... کچھ نہیں ہوتا تمہارے اسکول میں۔۔۔۔" وہ ساجد کے ساتھ مل کر کہتا۔

"اور تمہارے کالج میں بھی کچھ نہیں ہوتا بس۔۔۔۔" زبان سے تو اس کی سب عاجز تھے۔ حیرت تو اسے جب ہوئی جب اماں ایک دن بولیں:

"خیر سے اب تم نے امتحان پاس کر لیا۔ اب تمہاری منگنی ہو جائے' ہاں اور کیا۔۔۔"

منگنی کے نام سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور سینکڑوں گورے گورے نازک پتلی انگلیوں والے ہاتھ انگوٹھیاں پہنے اس کے سامنے ناچنے لگے۔ اس کا منہ سل گیا اور وہ کچھ کھو سی گئی۔

"دلہن سے میں نے کہا تھا کہ رجب میں کر دیں منگنی؟"

یعنی؟..... یہ اسکی منگنی اور اس میں یہ کچھ دلہن کا ذکر بھلا معلوم نہ ہوا۔ کہیں کہیں؟..... مگر توبہ کیجئے' بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اماں اندھی تھوڑا ہی تھیں۔

"ماشاء اللہ اب جوان ہو گئی ہے۔ کب تک بٹھائے رکھیں گے وہ۔"

"ارے! تو پھر..... تو پھر---- مگر آخر کیوں؟ یہ جان بوجھ کر کیا اس کی اماں واقعی اسے قتل ہی کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

"مگر..... مگر اماں----" وہ ہکلایا' سارا منہ سوکھ کر حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

"فخرن کا بھی امتحان ہو لے گا جب تک....."

"بس اب ٹھیک ہے۔"

"اماں..... مگر فخرن......" وہ بولنا چاہتا تھا۔ کہنا چاہتا تھا کہ کیا "تم گھاس کھا گئی ہو۔ دماغ چل گیا ہے۔ میرا اس کا نباہ بھلا ہو گا۔" مگر اس کی اماں بھلا سنتی تھیں' انہیں تو بجائے بیٹے کے وہ گیہوں زیادہ پیارے تھے جنہیں پھٹکنے کیلئے وہ چل بھی دیں۔

منو بچارا' سر پکڑ کر اس نے سوچنا شروع کیا۔

آہ! وہ سارے حسین نازک انگلیوں والے ہاتھ ہوا میں مقتول انسان کے ہاتھوں کی طرح کانپتے ہوئے نظر آئے۔ جن میں سے ایک پر بھی اس کی پسندیدہ وضع کی انگوٹھی نہ تھی۔

اوہ بھلا کیسے گذر سکتی تھی۔ اتنی موٹی' کند ذہن لڑاکا' بدمذاق ہنسوڑ اور وہ اتنا دبلا نازک مزاج' کم سخن اور شریف' بھلا یہ بھی کوئی جوڑ تھا اور پھر وہ بچپن سے اس کے چال چلن' طور طریق دیکھتا آیا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ وہ یوں خود کو اس طرح دفن ہوتے دیکھے اور چپ رہے۔ بغاوت کی لہریں اٹھیں اور دل و دماغ کو جھکول ڈالا۔ اس نے ایک نہایت مدلل اور موثر تقریر اماں کے لئے اور ایک نہایت دل شکن اور پراز طعن و تشنیع مقالہ ممانی کیلئے تیار کیا۔ جس میں اس نے نہایت ہی کٹتے ہوئے جملوں میں اس اندھی بے جوڑ شادی کے نقصانات اور فخرالنساء کی خوبیاں ظاہر کی تھیں۔

اس نے ایک مرتبہ مشق کی اور چاق و چوبند حسین و لطیف جملوں سے

آراستہ ہو کر گھر میں قدم رکھا' ٹاٹ کے پردے کے پاس اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے اور وہ مجسمہ بن کر کھڑا ہو گیا۔

"اللہ کرے بے گور و کفن لاش سڑے----" فخرن نے بالکل ہی نئے انداز کا کوسنا حال ہی میں ایجاد کیا تھا۔ جسے وہ رفیق کے اوپر آزما رہی تھی۔ منو کے دل میں اس کی طرف سے تازہ تازہ گرم نفرت کا ابال اٹھا۔ شاید اسے کچھ رحم آ جاتا کہ بچاری کی کہاں ہو گی شادی۔ ناک کٹ جائے گی۔ ڈوب مرنا پڑے گا۔ اگر اس نے ٹھکرا دیا۔ مگر اب تو اس کا دل اور دماغ دونوں ٹھوکر مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ جب وہ اندر گیا تو فخرن زینے کی آخری سیڑھی پر بیٹھی دوپٹہ میں منہ چھپائے بھوں بھوں رو رہی تھی۔ کاجل پھیلا ہوا لال چقندر منہ' منو کا اور بھی جی جلا۔

"تو یہ کون ہوتے ہیں' ہم کسی کو بلائیں' بڑے آئے رقعہ پھاڑنے والے----" وہ کہہ رہی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ فخرن اپنی سہیلیوں کو جھولا پارٹی میں بلا رہی تھی اور ان جھولا پارٹیوں سے گھر کے لڑکوں کا دم نکلتا تھا۔ سارے دن کیلئے گھر میں پردہ ہو جاتا تھا مگر گھر کی ہر کھڑکی اور دروازے سے وہ مہذب خواتین جھانک جھانک کر لڑکوں کا مذاق بناتی تھیں۔

"سجو کہہ رہی تھی رفیق بھائی جان کی صورت اشوک کمار سے ملتی ہوئی ہے۔" اور رفیق بچارے کا کان سرخ ہو جاتے' فخرن کو شہہ ملتی۔

"اجمل آپا کہتی تھی منو بھیا نیولے سے ملتے جلتے ہیں' چپکے اور گھنے۔"

"ساجد کا پتلون کیسے لٹکتا ہے؟ فہمیدہ کہتی تھی جیسے بھیگا ہوا تنبو...... ہی ہی......."

اور منو' رفیق' ساجد' محمود سب کے سب مغموم ہو جاتے' ان لڑکیوں کی رائے سن کر ان کے دلوں میں بغاوت کا جوش اٹھتا تھا۔ اور جی چاہتا تھا سب کو قتل کر دیں۔ مگر پھر بھی جس دن لڑکیاں جمع ہوتی تھیں رفیق بھائی جان صبح ہی سے شیو کرنا شروع کر دیتے اور ساجد اپنی پتلون کی شکنیں مٹانے کیلئے اسے تکئے کے نیچے دبا دیتا۔ پھر بھی جب وہ برآمدے میں سے گزرتا تو اسے یہی معلوم ہوتا کہ من بھر کا

بوجھ پتلون میں بھندھا ہے اور نیچے ڈھلکی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے کھلکھلانے کی آواز سن کر منو کی ناک آپ ہی آپ ہلنے لگتی۔ جبڑا ڈھیلا ہو کر بجنے لگتا اور گال پر کے عضلات پھڑکنے لگتے۔ رفیق کے تو ٹھاٹ تھے کہ بھئی اشوک کمار لگتا تھا۔ یہ آج کل لڑکیاں لوگوں کا سیمان والوں سے کیوں مقابلہ کیا کرتی ہیں۔ فخرن کی ساری دستیں لیلا چٹنس، کانن دیوی، رمولا اور جمنا سے ملتی جلتی بتائی جاتی ہیں۔ اور ایسے ہی ان کے بھائی بند پرتھوی راج، سہگل اور شاہنواز سے ملتے ہیں مگر گھر کے سارے لڑکے نیولوں اور چوہوں سے ملتے جلتے ہیں! ان باتوں پر سب کا خون کھول اٹھتا۔

منو نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پہلے ممانی کے پاس بیٹھا۔ ممانی کی نئی بچی نے جلد ہی اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اماں بیٹھی لوہے کی پھلیاں ناخونوں سے توڑ رہی تھیں، وہ ان کے پاس کے پلنگ پر بیٹھ گیا، اور ممانی بچی کو اوندھا کئے لوٹے کی دھار ڈال رہی تھیں۔

"اماں.....!" اس نے گلا صاف کیا۔

"اونہو..... اے یہ کیا جل رہی ہے..... خی... تھو۔" انہوں نے باورچی خانہ کی طرف تھوک کر کہا۔ جب کبھی منو ان سے کوئی سنجیدہ، نہایت ضروری بات کہنا چاہتا۔ وہ اسی طرح اپلوں اور لہسن کا ذکر کرنے لگتیں۔ مگر وہ نہ مانا۔

"اماں..... وہ آپ نے......"

"کیا بیٹے.....؟ اے تم نے آج لسی نہیں پی..... بیٹا فخرن میرے ہاتھ پیاز کے ہیں ذرا منو کو لسی تو بنا دو۔" فخرن کے رونگٹے رونگٹے نے صدائے احتجاج بلند کی اور وہ خونی نظروں سے منو کو گھورنے لگی۔

"جی میں آپ......"

"اٹھتی ہے کہ اب دوں ایک جوتی......" ممانی نے سلیپر اٹھا کر پھینکی جو فخرن سے دس گز کے فاصلے پر گری۔ ان عورتوں کے نشانے کتنے خراب ہوتے ہیں۔

فخرن دھما دھم پیر مارتی نعمت خانہ کے کواڑ جھنجھوڑنے لگی۔ لسی بننے لگی مگر منو کو معلوم ہو رہا تھا کہ بجائے دودھ شکر کے اس میں شاید چمچے رکابیاں ڈبے اور نعمت خانہ کے کواڑ کوٹ کر ڈالے جا رہے ہیں۔ خیر لسی بن کر آئی۔ اور منو سمجھا اب منہ پر گلاس لگا۔ مگر خیر وہ گلاس چوکی پر پٹخ دیا گیا۔ اماں جاتی ہوئی فخرن کو دیکھنے لگیں، ایک دم سے انہیں کچھ خیال آیا۔

"اے بیٹی فخرن..... ادھر آئیو....... ذرا یہ چھلا دینا..... نہیں یہ انگوٹھی دے دو۔

"تنگ ہے پھوپی اماں..... اترے گی نہیں......" روٹھے ہوئے گال پھلا کر کہا۔

"لاؤ میں اتاروں...... اونہہ...... اونہہ...... دیکھو ذرا اڑ کے رہ گئی.... لیجو ذرا......" انہوں نے منو کی طرف اس کا موٹا سا ہاتھ بڑھایا۔ منو کے ہاتھ سے لسی کا گلاس پھسل کر بھاگنے لگا۔ وہ تو شکر کرو کہ خود فخرن نے گال پھلا کر ناک سکیڑ کے جو زور لگایا تو انگوٹھی اتر آئی۔

"میاں..... یہ لو۔" فخرن کو جاتا دیکھ کر بڑے راز سے بولیں۔ "اس سے ذرا ڈھیلی رکھنا، ماشاء اللہ بڑھتا جسم ہے۔" اور منو کو معلوم ہوا کہ جیسے انگوٹھی نہیں بلکہ بڑا سا گھیرا ہے جیسے سرکس میں ہوتا ہے اور جس میں سے بندروں کو کدایا جاتا ہے۔

"اور یہ تین نگ...... کہنا جمعرات تک دے دے۔"

"مگر اماں..... یہ......"

"خدا کی مار دلہن---- اے لونڈیا---- اے لونڈیا، لیجو منو---- اے منو---- اے لونڈیا---- اے لونڈیا----!" ممانی کی چھوٹی بچی ادوائن میں سے آدھی لٹکی ہوئی نٹ بازی کر رہی تھی۔ حقارت سے منو نے اسے ایک طرف ڈالا۔

یہ صاجزادی ہوا میں اچھلنے سے بڑی خوش ہوتی تھیں۔ ان کے ایک بدمذاق

چچا آتے ہی انہیں ہوا میں اچھالا کرتے تھے اور اس کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ بس جہاں چچا سے ملتا جلتا آدمی دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر دوڑیں۔

"اے پیلے منو دیکھ تو کیسے مڑ مڑ دیکھ رہی ہے۔" منو چڑ گیا۔

"لاحول ولا قوت!"

"اپنے دولہا بھائی کو دیکھ رہی ہیں...." ممانی آ کر بولیں اور منو کا جسم بیٹھے بیٹھے دوڑنے لگا۔ بھاگا وہ وہاں سے۔

پست ہو کر وہ کمرے میں پڑ گیا اور شام تک نہ نکلا' ویسے بھی فخرن کی سہیلیاں آج چھائی ہوئی تھیں۔ صبح ہی جو وہ برآمدے میں سے گزرا تو جاسوسینوں کی طرح چلائیں۔

"فخرن تمہارے دولہا....." اور فخرن نے شرما کر ان کے گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ یہ عورت جب کبھی شرماتی تھی تو بجائے جھکنے وکنے کے ہمیشہ پہلوانی پر اتر آتی تھی۔ اور بادل ناخواستہ جب انگوٹھی بن کر آ گئی تو پھر اس نے گھر میں ہی جانا بند کر دیا' فخرن بھی اب پردہ کرنے لگی تھی۔ مگر یہ اس کا ہی کلیجہ جانتا تھا کہ وہ کیسا کچھ پردہ کرتی تھی' ویسے تو خوب سہیلیوں کے ساتھ مل کر اس کی زیست دشوار کر دیتی مگر جہاں کوئی کام کرتی ہوتی اور وہ گیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کوٹھڑی میں بھاگ جاتی۔

"ہٹ جاؤ برآمدے میں سے' ہم پالی خالہ کے یہاں جا رہے ہیں----" ایک دن حکم دینے لگیں۔ منو کھڑا برآمدے میں سر کھجا رہا تھا۔ اس کا جی جل گیا۔ اور چاہا' چق اٹھا کر ایک چپت لگائے' وہ بے رخی سے کھڑا رہا۔ کیا حکم چلاتی ہیں۔

"ہٹ جاؤ....." ذرا لجاجت سے کہا گیا---- "اچھے ذرا دیر کو...."

"کھا جاؤں گا کیا میں تمہیں..... چلی کیوں نہیں جاتیں۔"

"اوں!" چق میں سے کاجل لگی دو آنکھیں مچلیں۔ منو کے گھٹنے کمزور پڑ گئے اور اسے غصہ آنے لگا۔ جب کبھی وہ اس کی آواز سنتا تھا تو اسی طرح اسے کمزوری محسوس ہوتی تھی اور اس کمزوری پر آتا تھا غصہ' وہ برآمدے سے ہٹ گیا۔ اور وہ

دوڑتی ہوئی پالی خالہ کے مکان میں گھس گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے میل گاڑی منو کے نازک سے سینے کو دلتی ہوئی گزر گئی۔ لڑکی تھی کہ کرکٹ کی گیند! کھٹاک سے ماتھے میں کوئی چیز لگتی تھی۔

اور پھر وہ نوکر ہوا تو اس کی اور بھی ہمت ٹوٹ گئی۔ جب بھی اس نے گفتگو کرنا چاہی، اماں کو لوبیے کی پھلیاں، مونگ کی دال اور بیسنی روٹی میں غرق پایا۔ کاش صرف ایک دفعہ وہ ممانی کی چھوٹی بچی، کتے کی کونڈیلی اور جلتی ہوئی ہانڈی کو بھول کر اپنے اکلوتے ہونہار بیٹے کی طرف دیکھتیں، کیا وہ میتھی کے ساگ سے بھی گیا گزرا تھا، کیا اس کی حیثیت آلو کے ایک قتلے سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی، کیا وہ ارد کی دال سے بھی زیادہ نیچا تھا کہ اسے دو لفظ نہیں کہنے دیئے جاتے تھے۔

اور پھر اس کی شادی ہونے لگی۔ آئے دن عجیب و غریب وضع کے کپڑے، تاگے اور سوئیاں لانی پڑتیں۔

"اے وہ گریبان پر گجائی گم ہو گئی---- میاں ذرا سوا ماشہ لیتے آنا۔ ..... عطر دانی پر دھنک کم پڑ گئی ہے، ذرا گز بھر لے آنا..... پلو بچے کتنے تک کے ہوں گے، وہ زردوز موئے نے گوٹ پوری کی کہ نہیں..... اے میاں یہ مونڈی کاٹے نے موٹا سلما لگا دیا اور تم نے کچھ کہا بھی کہ نہیں......" اب بتائیے وہ کیا تو گجائی کو جانے اور کیا موٹے سلمے کو۔ ہاں دھنک بیشک وہ کئی دفعہ فخرن کی گڑیوں کیلئے لا چکا تھا مگر دھنک کے نام سے اس کے جسم میں شعلے بھڑکنے لگتے تھے۔ یہ عورتیں دھنک کیوں منگاتی ہیں۔

مگر وہ لاتا، سب کچھ لاتا۔ وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کہاں تک اس کی ماں ظلم توڑتی ہیں اس کی جان پر، کبھی تو پچھتاوا آئے گا۔

اور اس کی حالت غیر تو اس دن سے ہوئی جب ایک دن اسے کیچڑ میں بھیگا ہوا ایک جوتہ بھیجا گیا کہ دلہن کے لئے کامدار جوتی لاؤ۔ جوتے کو دیکھ کر وہ لرز گیا۔ چوڑا ٹیڑھا بدنما، زمانہ قدیم کے شراب کے قرابے سے لتا ہوا جوتا، اور اس قدر بڑا! کیا اس کی بیوی کا اتنا بڑا کدن چچا کے برابر پیر تھا۔ اس کے خود کے جوتے اس کے

سامنے نہایت نحیف و لاغر معلوم ہو رہے تھے' خود اس کے یہ جوتہ ڈھیلا ہوتا۔ خوف سے اس نے اپنے پیر کے انگوٹھے اکڑا لئے۔ اب بھلا وہ یہ جوتہ ناپ کیلئے لے کر دوکاندار کو کیا منہ دکھائے کہ صاحب ہماری دلہن کے لیے جوتہ دے دو---- اوہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

اور پھر شادی میں ہر ایک نے اس کا دل دکھایا۔ فخرن عرف عام میں دلہن پکاری جانے لگی۔ اس سے بھی اس کا جی جلتا۔ اتنی جنگلی بدمذاق عورت کو دلہن بنانا کہاں کی انسانیت تھی۔ دلہن بنی دیکھ کر اسے پھر کزموری سی آنے لگی اور خود سے اسے نفرت ہو گئی۔ جی چاہا بید سے اسے خوب پیٹے اور حکم دے کہ "چلو سیدھی طرح' یہ پڑیا بن کر کیوں بیٹھی ہو۔" مگر وہاں تو بادل ناخواستہ شکر کی ڈلیاں کھلانی پڑیں' کھیریں چٹانی پڑیں اور صدقہ واری ہونا پڑا۔

آرسی مصحف کے وقت اس کا قطعی دل نہ لگا۔ ہزار دفعہ دیکھ کر جس صورت سے جی متلا گیا ہو اسے کوئی کیا دیکھے۔ مگر وہ تو پیدا ہی مجبور بننے کیلئے ہوا تھا منہ دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ فخرن! کتنی عجیب شکل تھی اس کی!کہ بے اختیار وہ کھسیانہ ہو کر رومال سے عینک پونچھنے لگا اور گھنٹوں اس کے ہاتھ لرزتے رہے' جن میں دیر تک عطر اور مہندی کی بو ستاتی رہی۔

تھوڑے دن تک تو وہ کچھ مبہوت سا رہا۔ حیران اور ششدر۔ بیشک وہ بدقسمت تو ازل سے تھا ہی اور اب تو بالکل ہی بدتر حالت ہو گئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ فخرن اسے کچھ اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی پھولے ہوئے گالوں کی ضدی لاپرواہی کرنے والی لڑکی تھی۔ جب شادی ہوئی تو ایسے روئی گویا مر ہی تو جائے گی۔ ایک ہی گھر میں ماں سے گلے مل کر ایسے روئی گویا سات سمندر پار بیاہ کر جا رہی ہے اور دوسرے ہی دن سے ایسی خوش نظر آنے لگی جیسے کوئی ملک جیت لیا ہو۔ ماں کی طرف بھول کر بھی نہ جاتی۔ یہ نہیں کہ وہ کچھ منو پر عاشق ہو گئی ہو بلکہ منو سے زیادہ تو وہ اپنے چاندی کے پاندان' نکے ہوئے جوڑوں اور دست بند اور جھمکوں پر زیادہ فریفتہ تھی' منو چاہتا شروع سے اس کا زیادہ لاڈ نہ کرے اور بے

رخی سے اس کا دل دکھا کر کلیجہ چھلنی کر دے، مگر اسے بے رخی کا موقعہ ہی کب ملتا؟ اس سے قبل کہ وہ بے رخی دکھائے، وہ پڑ کر سو جاتی اور ذرا بھی جگاتا تو زور زورس سے اوں اوں کر کے غل مچاتی، ذرا سا گھر، پاس کے کمرے میں اماں سوتی تھیں!

ماں کے انتقال کے بعد وہ گھر پر طاعون کی طرح چھا گئی۔ ساری تنخواہ کوڑی کوڑی کر کے گنوا لیتی اور پھر خرچ پر وکیلوں جیسے سوالات کرتی اور قابل اطمینان حساب دے دینے پر بھی وہ مشکوک نظروں سے دیکھتی۔

"خوب جانتی ہوں میں!" وہ ہوشیار بن کر کہتی۔

"مجھ سے گھر کا کرچ نہیں چلتا، ہاں نہیں تو.... ایسے روپیہ پھونکو گے تو کیا رہے گا----"

"کیا پھونکا ہے میں نے روپیہ.....؟" حالانکہ وہ خود کماتا تھا۔

"کس نے کہا تھا کہ تم یہ بلاوز کا کپڑا لاؤ----" یہ لیجئے گویا یہ بلاؤز بھی اب وہ خود پہنے گا۔

اسی منحوس کیلئے لایا اور پھر اوپر سے ٹکا سا طعنہ سننا پڑا۔

صابن کی ٹکیاں تین تین پڑی ہیں، اور لے آئے، کس نے کہا تھا تم سے؟"

"ارے بھئی ہر چیز مہنگی ہوتی جا رہی ہے، میں نے کہا لاؤ تھوڑا زیادہ خرید لوں، کام ہی آئے گا----"

"ہوں کام ہی آئے گا----" وہ بڑبڑاتی۔ حد تھی زیادتی کی۔ خود تو نہ جانے کیا کیا الا بلا خریدتی۔ کچھ نہیں تو شیشے کی پیالیاں ہی خرید لیں۔ یہ بھئی کیوں؟

"اے بھئی ہمیں پیاری لگتی ہیں!" اور نہیں تو کاغذ کے پھول خریدتے، یہ کیوں؟

"اے بالکل اصلی لگتے ہیں، تمہاری میز پر سجائیں گے!"

"یہ مٹی کی گائے کیوں خریدی؟"

"اے لو یہ تو اتنی اچھی لگتی ہے جیسے سنگ مرمر کی!"

"اور یہ دیوکے بکھوں منگائے گئے ہیں----"

"ہی..... ہی ہی ہی ...... تمہیں کیا..... ہم دیوالی پر جلائیں گے..... ہی ہی....." یہ لیجئے!

"بہت روپیہ ناس کرتی ہو---- سنو جی! تم نہیں تھیں تو سو روپیہ بچتے تھے---- اور----"

"ہوں سو نہیں ہزار بچتے تھے- پھوپی اماں تھیں تو میرے کتنے جوڑے بنا کرتے تھے---- اور اب....."

"اجی اب کون سے کم بنواتی ہو----" ماں کی تعریف ہمیشہ اسے کمزور بنا دیتی تھی-

"خاک بناتی ہوں اپنا کفن!" کفن کے ذکر پر اسے ہمیشہ ایک ہولناک واقعہ یاد آجاتا' جب اس نے باریک عمدہ ململ کے کرتے بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پہلے تو وہ اس بات کو ہی ٹالتی رہی اور پھر جو ایک دن کپڑا دیکھا تو ٹال مٹول کے بعد کتے کے کفن جیسی ململ پسند کی-

"اے ڈھل کے ایسی نکلے گی کہ کیا بتایا جائے-" وہ خاموش مجروح بیٹھا رہا تو شرمندہ ہو کر آخر اس نے سترہ روپے گیارہ آنے کا تھان خرید لیا- یہ تھان وہ جب کبھی خرچ کا ذکر ہوتا یا روپیہ کی تنگی ہوتی وہ ضرور حساب میں لگا لیتی اور اس سے قبل کہ وہ اسے طعنے دینے کیلئے مواد جمع کرے وہ پڑوسن سے بکواس کرنے' ماما سے لڑنے یا صندوق کریدنے چل دیتی یا بس "ہی ہی" شروع کر دیتی اور اس کے پیروں میں گدگدیاں شروع کر دیتی-

"دیکھو جی تم بات ٹال جاتی ہو-"

"تو کیا ہے؟ ہائے اللہ میں تو مر جاؤں---- لے کے کھاتے جاتے ہیں' دن رات کا گودنا' یہ کیوں کیا' وہ کیوں کیا---- ہائے کمر میں درد ویسے ہی اٹھ رہا ہے-" وہ فوراً بیمار ہو جاتی-

"قسمت پھوٹ دی گئی..... اور پھر کچھ کہوں بھی نہیں-"

"تو کیا کروں میں..... سدا ہی سے مجھ سے تو جلتے تھے تم- جل ککڑ

کہیں کے---- وہ تو میری پھوپھی اماں ہی مجھے چاہتی تھیں---- امان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھیں۔"

ماں کے ذکر سے منو کا دل ہچکولے کھانے لگتا اور پھر اکھاڑے جم جم کر لڑائی ہوتی۔ ایک دن تھوڑی' ساری عمر کا معاملہ تھا۔ بات بات پر لڑنا' روٹھنا' تھو تھنی سو جانا' کھانا نہ کھانا۔ یہ نہیں کہ اس کے ایک دن کے نہ کھانے سے کچھ دبلی ہو جاتی تھی۔ وہ تو دس برس نہ کھاتی تو کافی چربی اور گوشت موجود تھا۔ وہ خدا سے چاہتا تو تھا کہ ذرا دبلی ہو جائے کہ کچھ تو اس کی بیوی جیسی معلوم ہو۔ کیا جوڑ تھا بھلا لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ بھلا یہ بھی میاں بیوی ہیں۔ دنیا جہان کی بیویاں نازک نازک پھول جیسی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ چلیں تو معلوم ہو کہ سڑک کٹ رہی ہے۔ پلنگ پر کروٹ لیں تو پڑوسن تک چراہٹ سنیں اور وہ اتنا نازک---- بالکل شاعروں جیسی پتلی گردن اور دبلے ہلکے بازو ۔ کہیں دور اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو چھپی ہوئی تھی کہ---- کہ وہ بھی کسی پھول جیسی ہلکی پھلکی تیتری کو یوں بازوؤں میں اٹھا لے جیسے..... مگر وہ اس آرزو کو دماغ سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

ایک بات سے اسے سخت ہتک محسوس ہوتی تھی' وہ فخرن بی نے اس کے چال چلن کے متعلق عجیب و غریب نظریہ قائم کر لیا تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اسے بدمعاشی اور آوارگی کے ناقابل سمجھتی تھی۔ گو وہ کبھی بدراہ تو نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی اکثر کلب یا لکچر وغیرہ میں بہت رات ہو جاتی۔ مگر ایک دن بھی جو اس نے پھوٹے منہ سے دو حرف الزام کے لگائے ہوں اور جو کہتی بھی تو یہی کہتی۔

"نہ جانے کن کن لوگوں میں مارے مارے پھرتے ہو....." گویا وہ صرف لوگوں ہی میں پھرتا تھا۔ عورتیں تو اس نے دیکھی ہی نہ تھیں۔ آخر اس میں رقابت کا ذرہ بھر بھی مادہ نہ تھا' یہ اس کی ہتک تھی' دنیا بھر کی عورتیں جلا کرتی ہیں اور عموماً" ہر ایک میاں کی جیب میں ایک رقیب مثل پولیس مین کے ڈنڈے کے چھپا رہتا ہے جسے موقع بہ موقع بیوی کی چاند پر مار کر مزا لیا جا سکتا ہے۔ بہت سے میاں تو صرف تخیلی رقیب بیوی کے لئے تیار رکھتے ہیں۔ بیوقوف فخرنین ناک چڑھا کر کہہ

دیتی ہے۔

"اے چلو' بس معلوم ہے ایسے ہی بت طناز تھے تو شادی سے پہلے نہ کر لیا کسی سے کچھ' اے تم ہمیشہ کے "سیدھے" ہو۔ کسی طوائف کے یہاں تو جانا بھی مت' بڑی چٹاخ چٹاخ ہوتی ہیں یہ' بغلیں جھانکنے لگو گے....."

اور جو ذرا عقل مند ہوتی ہیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بسور دیتی ہیں اور میاں باغ باغ!

دن پہاڑ سے گزرنے لگے۔ عمر چلتی چلی گئی۔ فخرن اور منو کبھی ان کے دل نہ ملے۔ اب بھی بڑھاپے میں منو کو سینکڑوں کیڑے اس میں نظر آتے۔ وہ اب بھی ویسے ہی تابڑ توڑ لڑتی۔ جوان جوان بیٹے داماد اس پر مسکراتے' بہوئیں بیٹیاں ہنستیں!

"کتنا کہتا ہوں کہ مرچیں نہ کھایا کرو' خونی پیچس ہے!"

"تمہاری بلا سے مرنے دو......" وہ اسی طنطنہ سے جواب دیتی۔

"یہ مصنوعی دانت ہیں ہڈی توڑنے سے چٹخ جائیں گے---- ایسی ہڈیاں کتوں کی طرح چابنے کی بڑھاپے میں کیا ضرورت ہے----"

"تم اپنی کہو بڈھے ہو گئے مگر جوان بچوں کے سامنے لڑنا نہ گیا---- اے ہاں نہیں تو جان کو آ گئے ہیں میری!"

"سٹھیا گئے ہیں بٹی تمہارے نانا ابا..... سدا کے جھکی ہیں۔" وہ اپنی نواسی سے کہتی۔

"یہ تمہاری دادی اماں بس ہمیشہ کی تیتا مرچ ہیں۔ کیا بتاؤں بیٹا مجھے تو کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھائیں...... شروع سے نفرت تھی۔" وہ اپنے پوتے سے کہتا۔

"ہاں میں ہی تو گئی تھی تمہاری دہلیز پر کہ لو کر لو مجھے---- سو دفعہ ناک رگڑی تھی۔ تھے تم کس قابل ہمیشہ کے بھنکنے روگی---" وہ بدمزاجی سے پاندان کی چٹخنی ہلاتی اور سروتہ تلوار کی طرح گھماتی' اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ پوتے پوتیاں ہنسی دباتے کمروں میں بھاگ جاتے۔

"میں کہتا ہوں تمہیں کچھ شرم حیا بھی ہے یا نہیں---- یہ جالی کا کرتہ اور

ساری......"

"چلو تم تو بڑے شرمیلے ہو...... کل تہبند باندھے دھوپ کے رخ کھڑے تھے...... سچ کہنا رحمانی بوا میرا وضو ٹوٹ گیا تھا کہ نہیں----" وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھال لیتی۔

"اے بی کیوں منہ کھلواتی ہو...... پیڑھی کھڑی کر کے نہانے بیٹھ گئیں۔ سمجھتی ہو کہ ماشاء اللہ تمہارا سا ڈیل ڈول پیڑھیوں سے چھپتا ہے۔"

"اے مردوئے دماغ خراب ہوا ہے کچھ..... پیڑھی تھی کہ یروتی بیگم کی کھٹولی----" وہ غصہ سے آپے سے باہر ہو جاتی۔

"وہ کھٹولی ہی سہی مگر خدا کی بندی......" اور گھنٹوں چخ چخ ہوتی' یہاں تک کہ وہ اپنا پرانا داؤ چلاتی اور فوراً بھینس کی سانی۔ لکڑی کے رائیتہ اور سل کی کھٹائی پر نوکروں چاکروں سے تو تو میں میں کرنے لگتی' بیچ میں شگوفے چھوٹتے۔

"یہ ہے مہذب عورتوں کی زبان---- کہو بھلا آفتاب بچارا نوکر ہوا تو کیا' ہے تو سید! اور اسے یہ حرامی پلہ کہہ رہی ہیں---- شریف خاندان کی عورت اور یہ----"

مگر اسے مجبور ہو کر باہر چلا جانا پڑتا۔ وہ اداس ہو کر اخبار میں معمہ حل کرنے لگتا۔ دس سال سے وہ اسی فکر میں تھا کہ ایک معمہ کا حل ٹھیک ہو جائے اور بیس ہزار کا انعام لے کر دور کہیں خوابوں کی حسین وادی میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے!

پھر وہ نئی زندگی جس کا آئے دن کی بیماریوں اور بدہضمی نے اسے اور بھی منتظر بنا دیا تھا شروع ہو گئی۔ آخری معمہ کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی پرانی دستوں کی بیماری عود کر آئی۔ سارے غم سارے صدمے میلے کپڑوں کی طرح اتر پڑے اور ہلکے پھلکے چھے کی طرح وہ ہوا کی نسوں پر پھدکنے لگا' جنت! آخر تو اس کی ریاضت اور صبر کا اجر مل گیا۔ اس نے اپنے غیر مرئی ہاتھ ہوا میں اچھالے اور پھر انہیں اپنی پسلیوں پر رکھ کر نیچے پھیلایا---- سب آسان' ذرا بھی تو کھردرا پن نہیں۔ اس کا سر غبارے

کی طرح ہلکا ہو گیا اور پیر سائکل کے پہیوں کی طرح تیز!

اوہ! وہ ٹھٹک گیا! لاحول ولا قوۃ فیشن ایبل لڑکیوں سے اسے ہمیشہ چڑ تھی۔ کھلی باہوں کے جمپر' ساری بغلیں دکھائی دیں اور نیچا گلا۔۔۔۔ وہ اپنی نواسیوں پوتیوں سے اسی لئے تنگ تھا کہ وہ آدھی آستین پہنا کرتی تھیں اور یہاں تو پانی کی لہر جیسے سائے کے سوا کوئی چیز ہی جسم پر نہ تھی۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ جنگی شکل بنا کر لعنت و پھٹکار کے پلندے لئے بڑھا۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔

"اے میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔۔۔۔" جانی بوجھی آواز آئی' وہ ٹھٹک گیا اور کانوں کے سوراخوں کو ہلا کر جھاڑنے لگا۔۔۔۔ شاید دنیا سے کوئی مکروہ آواز پڑی چلی آئی' ایک قدم بڑھا۔

"خوب کرو غنڈائیاں۔۔۔۔ تاکا جھانکی!" شک یقین میں بدلنا شروع ہوا۔

"افوہ۔۔۔۔ تو تم یہاں بھی۔۔۔۔" وہ مجروح ہو کر مڑا۔

"کیوں؟ میرا آنا ایسا کھلا اور وہ جو تمہاری لاڈو کھڑی تھیں تو کچھ نہیں۔"

"کون؟ میری کون؟"

"وہی غمپارہ جسے تکا جا رہا تھا۔ میں کہتی ہوں بوڑھے ہو گئے' آئے دن کے روگی' دست گھڑی بھر کو نہیں رکتے مگر آوارگیاں کروا لے کوئی تم سے۔۔۔۔ اے شرم بھی نہیں آتی تمہیں' نگوڑی پوتی کے برابر۔۔۔۔ حرامزادیاں ہر ایک سے دیدے لڑاتی پھرتی ہیں!"۔۔۔۔ وہ جاتی ہوئی جور کے اٹھلاتے ہوئے قد کو نفرت سے گھورتی ہوئی بولی۔

"اے۔۔۔۔ ہے! میں کہتا ہوں میں ادھر دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ اور تم۔۔۔۔"

"ارے میری جوتی سے' تم جدھر چاہو دیکھو۔۔۔۔ مگر میں کہتی ہوں کون سے تم نے ثواب کئے تھے جو تم بھی۔۔۔۔ کیا نام یہاں آ گئے۔۔۔۔"

"اور تم نے کون سے حج کئے تھے جو مجھے کہہ رہی ہو۔ اللہ کی بندی بھول کر

بھی سجدہ نہ کیا کبھی!"
"لو تم نے مجھے کبھی روزے نماز کا رکھا بھی۔ آئے دن کے چونچلے' آئے دن کے نگوڑے بچے ----"
"تو اب اپنے گناہ بھی میرے اعمال میں لکھا دو ----"
"حج کو تو ہزار کہا' تم نے کبھی سنا ---- ایمان سے کہہ دو۔"
وہ حسب معمول لاجواب ہکلا کر رہ گیا۔
"مگر میں کہتی ہوں کیا اب یوں ننگ ملنگ پھرا جائے گا ---- ذرا دیکھو تو شرم بھی تو اڑ گئی تمہاری' پتہ سارا چھنی ہو رہا ہے۔" وہ اور گھبرایا اور کیڑے لگے ہوئے انجیر کے پتے کو ٹٹولنے لگا۔
"اے وہ موئی کریب کی اوڑھنی میں نے تو ساری حرامی پلے کے منہ پر۔"
"اکی! چہ چہ ---- ارے خدا کے قہر سے ڈرو یہ جنت ----"
"ہوش کی لے مردوئے' دوزخ ہو کہ جنت' بندی سے تو ان سنڈوں کے سامنے ننگا نہیں ناچا جاتا ---- کان کھول کے سن لو ----"
"اوہ ---- یا خدا ---- کیوں جی ---- اے ---- سفید عمامے والے ---- اے میاں۔"
وہ ایک مقدس شکل دیکھ کر چلایا ---- کوئی جنت کے اسٹاف میں سے تھا۔
"ارے بھئی ---- وہ یہاں ---- میرا مطلب ہے کتنی دیر ٹھہرنا ہو گا ----"

"یہ آخری مقام ہے ---- بہشت بریں ----"
نڈھال ہو کر اس کا جسم آگے پیچھے جھکنے لگا ---- اور ----
"یہ موئے پتے کیا مجال جو گھڑی بھر کو رک جائیں ----"
اس نے جلدی سے کانوں میں انگوٹھے ٹھونس لئے ----!

❀❀❀

ہیرو

سکھّا نے چولھے کے آخری کونوں سے راکھ گھسیٹی اور چپٹی رکابی چوٹی تک بھرلی۔ حلق میں سے کڑوی کڑوی راکھ چھینکتا وہ نل کی طرف لپکا۔ جہاں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر کسی پھوہڑ کے بچے کی طرح مچلا پڑا تھا۔ دخل در معقولات سے چڑ کر مکھیاں الجھے ہوئے دائرے کھینچتی اوپر اٹھ گئیں۔ رکابی میں سے تھوڑی سی جھوٹن پونچھ کر اس نے موری پر ڈال دی۔ وہ یہ غلاظت صرف مکھیوں کے مارے نہ پھیلاتا، مگر آج نہ جانے کیوں اسے ہر چیز پر پیار آرہا تھا۔ آج حمیدہ بی آرہی تھیں نا۔ ابھی تو چار گھنٹے تھے ریل کے آنے میں۔ آج وہ اٹھا بھی صبح تڑکے تھا۔ صبح ہی صبح چائے نمٹا کر شام کا مصالحہ بھی رگڑ دیا کہ کہیں باورچی بہانے سے روک نہ لے۔

آج لوگوں نے جان بوجھ کر برتن زیادہ جھوٹے کیے تھے۔ چھوٹی بڑی بیس بائیس رکابیاں چار ڈونگے، چھ پیالے، دو قابیں، تین ڈشیں اور ان گنت چمچے چمچیاں، اور کانٹے، تین پتیلیاں، چار دیگچیاں اور سینیاں---- اچھا بھلا ایک شریف بیٹی کا جہیز روز کے روز اسے مانجنا ہوتا۔ پر آج تو اسے کھل اٹھا۔ اتنا کام اور اوپر کے کام پر بس ایک چھوکرا۔ اس کا بس چلتا تو پیروں میں پھٹے اور بغلوں میں پر لگوا لیتا---- کہ ایک ہی وقت میں وہ سارے گھر کے پکار کا جواب دے دیتا۔

"ننھے میاں کے جوتے، جی ابھی لایا---- کتھا---- کتھے کی پیالی لایا دو منٹ میں---- کیا گلابی پیچک؟ بس منے میاں کی فٹ بال میں ہوا بھر لوں تو ابھی لایا---- اچھا لہسن---- ادرک تو پیس دی اور چنے------ اچھا وہ اخبار

سویرے والا ----- برف ----- برف کا پانی؟ جی ابھی لایا" ----- لوگوں کا بس چلتا تو اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے کر کے نگل جاتے۔ مگر سکھا ہی تھا۔ جو سینہ سپر کئے ہوئے ڈٹا ہوا تھا۔

اب تو وہ اتنا سوکھا مارا بھی نہ تھا۔ نہ جانے لوگ اسے سکھا کیوں کہتے تھے۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا نام نورالدین تھا۔ پر لوگوں کے منہ دکھتے تھے اس کا پورا نام لینے سے۔ تھا بھی تو کوئی من بھر کا نام ہونہہ -----! برتن مانجھنے میں اس کے خیالات کی ڈور کتنی ڈھیلی ہو جاتی۔ پرانی بان کا جونا بنا کر سرمئی راکھ سے وہ برتنوں کو بڑے اطمینان بھرے انداز سے گھسا کرتا ----- جھائیں مائیں ----- راکھ کی کسکساہٹ بھری جھنجھناہٹ اور بھی اس کے خیالات کے راستہ کو چمکنا اور پھسکواں بنا دیتی۔ اس طرح تو اسے تھکن بھی تو نہ معلوم ہوتی۔ جانو کوئی مزے دار ساز پر کسی لطیف نغمے کا الاپ کر کے اٹھا ہو۔ برتنوں کو چوکی پر رکھ کر وہ ذرا اپنے تن کی خبر لیتا۔ ایک بار نظر ڈالو تو وہ بالکل چچوڑی ہوئی ہڈی معلوم ہوتا۔ جسم اور کپڑوں پر اتنے رنگوں خوشبوؤں اور مصالحوں کے داغ لگ جاتے جیسے برس ہا برس سے اسے فرش جھاڑنے کی جھاڑوں کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ جھٹ پٹ میلی بنیان باندھ کر نل پر نہانا شروع کر دیتا نہا دھو کر وہ بالکل اجلی قمیض پہن سولہ سنگھار کر اردو کی چوتھی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ وہ وقت ہوتا۔ جب وہ موریوں اور کیچڑ کی دنیا سے بہت اونچا ہو کر علماء کی سوسائٹی میں پہنچ جاتا اور عام طور پر اس شاندار وقت کو تباہ کرنے باورچی کی چھوٹی، مگر موٹی لڑکی عدیا اٹھلاتی جھانجھن بجاتی آج پہنچتی، آتے ہی وہ کوئی زک پہنچانے کی تدبیر سوچ نکالتی۔ کچھ نہیں تو نل پر کھڑی ہو کر زور زور سے چھپکے مارنا شروع کر دیتی۔ "نہیں مانے گی کلوٹی ----" سکھا محبوب اکھتا۔

"چل گنجے ----- کوئی تیرے باپ کا نل ہے ---- عدیا کالی تھی ---- پر سکھا کے سر پر تو بھر ٹوکرا بال تھے۔ ایسے گھنے کہ ننھے میاں کو اس کے سر پر چپت مارنے کے لئے گردن پر سپاٹا بھرنا پڑتا تھا اور گویا سپاٹا زیادہ تکلیف دہ ہوتا مگر

مار پیٹ کے اصول سے قطعی نیچے گر ہوا------ اور تحقیر کن!

ہے بھی! خود تو گنجی ہے----- چٹیا ہے کہ چوہے کی دم------

گنوارن کہیں کی۔"

اور تو بڑا لاٹ صاحب ہے----- ہونہہ-----" عدیا کی اینٹھی ہوئی گدی سے چار انگل اونچی لال پیلا کلا وہ پڑی چوٹی واقعی اس کی دکھتی ہوئی رگ تھی۔ کتنا کتنا وہ چلاتی پچھاڑیں کھاتی پر ظالم اماں ایسی اینٹھ کر بال گوندھتی کہ بالوں کی جڑیں تک ہل جاتیں، اس کا سر دونوں گھٹنوں میں دبوچ کر چوٹی ایسی مضبوطی سے گانٹھتی گویا کوئی گٹھڑی کس کر باندھ رہی ہو۔ ہر بل پر دانت بھینچ کر کہنیاں ہوا میں معلق تان کر ٹھوک ٹھوک کر جھٹکے مارتی کہ کیا مجال جو ایک رونگٹا بھی باہر باہر چھوٹ جائے۔ آٹھویں دن دو چار مسکین سی لٹیں ذرا سانس لینے کو باہر رینگ آتیں اور ڈائن تیل کی کپی اور کنگھی لے کر پل پڑتی۔

عدیا کی اور سکھا کی چار منٹ کو بنتی اسے یوں گیانیوں کی طرح بیٹھا دیکھ کر عدیا کے تن بدن میں چنگاریاں سلگنے لگتیں۔

"آوے نہ جاوے بڑے پڑھ رہے ہیں-----" وہ اپنی لال اوڑھنیا فیشن ایبل انداز سے کاندوں پر پھیلائے بالیاں جھلاتی آن پہنچتی۔

"دیکھ بھئی ہم تجھ سے نہیں بول رہے---- سنا"----- وہ سنجیدگی سے ورق الٹ دیتا۔

"اور تم سے کون بول رہا ہے------- واہ جی وا------"

"اچھا------ نہیں مانے گی-----"

"ہونہہ کوئی تمہاری کبوتر جیسی آنکھوں سے ڈر ہی تو جاؤں گی۔"

"اچھا ہم ادھر جاتے ہیں----- ہمت ہو تو آ جائیو-----" وہ لمبے لمبے ڈگ مارتا اصطبل کی طرف چل دیتا اور اصطبل عدما کی حدود سے باہر تھا۔ باورچی کے احکامات صادر ہو چکے تھے، کہ اصطبل کی طرف گئی اور ٹانگوں کے پرخچے اڑے، عدیا سکھا کی بے مہریوں کی وجہ بھی جانتی تھی، اماں کمبخت کسی طرح سمجھتی ہی

نہیں، ویسے دن رات کی ٹیس ہے کہ کنواری لونڈیا سینے پر سل پڑی ہوئی ہے، کہں بھلا یہ زمانہ لال اوڑھنیوں کا ہے---- یا بہت ہوئی تو محرم پر ہری بن گئی جو میلی کچیلی ہو گئی تو اودی یا نارنجی کروالی---- بس---- ہاں سکھا ویسے ہوشیار تھا۔ مگر عدیا کونسی بری تھی۔ ہاں ذرا دماغ کمبخت کمزور پیدا ہوا تھا۔ بڑی بیوی جی نے اللہ ماری کی کمر پر ہزاروں پنکھیاں توڑیں مگر آم کے پارے سے آگے نہ پڑھ کے دیا۔

کاش وہ زندگی میں ایک بار صرف ایک بار حمیدہ بی جیسا باریک ململ کا ہوا جیسا گلابی یا آبی رنگ کا دوپٹہ اپنے شانوں پر ڈال سکتی یا وہی کبوتر کے پروں کے رنگ کا بھورا بھورا ہلکا سا دوپٹہ یا کامدانی کا کیا سی شنان کا ہی سہی جس کی چنٹ دن بھر بھی اوڑھو تو بھی نہ کھلے---- پر حمیدہ بی اوڑھتی بھی تو پولے پولے ہیں۔ یہ تھوڑی کہ اماں کا حکم ہر وقت "ارے نصیبوں جلی دوپٹہ آگے کو لے----" بس ہر وقت خون سرخ لٹھے کی کوٹھری میں گھٹے ہوئے سسکیاں بھرا کرو۔

اور آج حمیدہ بی آ رہی تھیں۔ عدیا کو حمیدہ بی رتی برابر پسند نہ تھی آتے ہی وہ اس کی جوؤں کی خیریت پوچھتیں اور آم کے پارے کا دردناک ذکر چھیڑ دیتیں۔ بڑی بیوی جی کو اپنی ہار پر نئے سرے سے تاسف ہونے لگتا اور وہ نیا آم کا پارا منگا کر اس کی کمر پر پنکھیاں توڑنا شروع کر دیتیں اور اس دفعہ تو انہوں نے بڑے مشہور مقام کے بانس کے چرخی دار پنکھے منگائے تھے۔ جنہیں وہ پھرکنی کی طرح گھما کر مارتیں تو دوگنی چوٹ لگتی تھی۔ دوسرے حمیدہ بی تھیں بھی نک چڑھی کل ان کا کمرہ صاف کرنے وہ اور سکھا گئے تو چھپکلیوں سے ڈر کر عدیا تو کونے میں بیٹھ گئی اور سکھا مارا مارا کمرہ جھاڑنے لگا۔ حمیدہ بی کا کام کرتے وقت وہ ایسی تندہی دکھاتا جیسے عقبی کے لئے توشہ سمیٹ رہا ہو۔ وہ جل کر رہ گئی۔ املتاس کے زرد پھول گلدان میں لگاتے دیکھ کر وہ تحقیر پر تل گئی۔

"املتاس سے تو جلاب لیا جاوے ہے۔"

"تو اور کوئی پھول ہیں بھی تو نہیں۔"

"دیکھ لیجیو، پھینک دیں گی حمیدہ بی۔"

"ہونھ۔۔۔ پھینک دیں گی۔۔۔ جانتی بھی ہے انہیں زرد رنگ کتنا پسند ہے۔"

"ہوں۔۔۔ جبھی پیلی بنیان پہنی گئی ہے۔۔۔"

سکھا کے کان خون کی شدت سے نیلے پڑ گئے۔ یہ بات تو تھی کہ اس نے بنیائن پینٹ کر رکھی تھی۔ مگر عدیا کی بچی چڑیل کون ہوتی ہے۔ عدیا بھی سمجھ گئی کہ چوٹ گہری پڑی اور کھسک جانے میں ہی سلامتی ہے۔۔۔۔۔۔ کھلے میدان میں سکھا سے نبٹ لیتی۔ مگر یہاں گھر میں تو سبھی اس کے دشمن تھے وہ تھی بھی بڑی بدنام۔ جب کوئی بلاتا تو سکھا کھانا کھاتا ہو۔ جب بھی قلانچیں مارتا پہنچ جاتا۔ پر عدیا کو ذرا گنگنانے کا شوق تھا۔ اس لئے لوگوں کی پکار ذرا کم سنائی دیتی۔

"میرے آتے ہوں گے چت چودو۔۔۔ر۔۔۔۔" وہ تیسری آواز پر چت چور کے تخیل سے چونک کر سنتی۔ پھر دل میں شبہ ہوتا کہ جانے بھائی کسی نے پکارا بھی تھا یا یونہی اس کے کان بجتے تھے۔ جب پکار کی حقیقت واضح ہو جاتی تو پھر وہ متحیر ہونا شروع کرتی کہ آخر کیا کام آن پڑا جو وہ پکاری گئی سچ تو ہے پتہ تک نہ ہو کہ انسان کس کام کے لئے بلایا جا رہا ہے تو پھر کیا دل لگے جانے میں۔ اور بہت ممکن ہے کوئی کام بھی نہ ہوا اور صرف "کچھ نہیں" کہنے کے لئے پکارا جا رہا ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ اچھا بھلا بنج گٹوں کا میچ چھوڑ کر آئی اور جواب ملا۔۔۔"اچھا کچھ نہیں"۔۔۔ "رہنے دو"۔۔۔۔۔ وہ چڑ کر رہ جاتی ایسے غیر مستقل مزاج آقاؤں کی یہی سزا ہے کہ پکارتے پکارتے کمبختوں کے نرخرے پھٹ جائیں جواب نہ دیا جائے۔ دوسرے پکار کے جواب میں جب وہ پہنچتی تو بدقسمتی سے اتنی دیر ہو چکی ہوتی کہ پکارنے والے کی دماغی حالت کا بھروسہ نہ رہتا مار کا اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا۔

پر شام کو زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے جب حمیدہ بی آئیں تو سکھا نے جھٹ کر انہیں سلام کیا۔

"اوہو بڑے ٹھاٹ ہیں سکھا---" وہ مسکرائیں اور سکھا کا تیل میں ڈوبا ہوا ماتھا بینگن کا چھلکا بن گیا۔ اگر اس کے سامنے آئینہ ہوتا تو دیکھتا کہ پیلے بنیائن میں سے نکلا ہوا اس کا لمبوترا چہرہ بالکل املتاس کی پھلی معلوم ہو رہا تھا۔ عدیا کونے میں کھڑی نتھنی کی گونج گھماتی رہی۔

دوڑ دوڑ کر سکھا نے حمیدہ بی کا سارا سامان اوپر پہنچا دیا۔ چمڑے کا بھاری بکس ہاتھی کے برابر بستر اٹیچی کیس، تھرماس وائلن کا بکس، سفر کا کوٹ ایک بھی چیز اس نے نہ چھونے دی کسی کو۔

"کچھ نہیں ہوتا موٹلی بھینس ہے۔" اس نے عدیا کو اینڈ اینڈ کر پھلوں کی ٹوکری سے الجھتے دیکھا تو دانت پیس کر دوڑا' عدیا نے اپنی ننھی سی ناک کو ایک طعن آمیز ٹھمکی دی اور ٹوکری کو جان کر دور دھکیل دیا۔ دو امرود دوڑتے ہوئے چبوترے سے نیچے جا پڑے۔ ایک دفعہ سکھا کا جی چاہا عدیا کو ایسا دھکا دے کر امرودوں سے بھی چار ہاتھ آگے جا پڑے۔ مگر اتنے میں حمیدہ بی آگئیں اور اس کا غصہ بجھ گیا۔

جب وہ چائے لے کر اوپر پہنچا تو چائے کے برتن سینی پر پھدکنے لگے اور اسے جلدی سے میز کا سہارا لینا پڑا---- سامنے آئینہ کے سامنے کھڑی حمیدہ بی اپنے بالوں میں زرد املتاس کے پھول لگا رہی تھیں۔ "یہ تم نے لگائے ہیں سکھا۔"

"جبھی!" اس نے بلاٹنگ کی بھیگی ہوئی گڈیوں کو حلق میں بھینچا۔

لپک کر وہ بستر کھولنے لگا۔ کھولتے کھولتے جیسے اس کے کسی نے سوئی چبھو دی اور دونوں تکئے ہاتھ سے چھوٹ پڑے قمیض! حمیدہ بی کی نہیں۔ مردانہ قمیض۔ سگریٹ کی بو میں غرق ملگجی سی۔ اس نے قمیض اٹھائی پھر پھینک دی---- پھر اٹھائی دو انگلیوں سے جیسے وہ کوئی سڑا ہوا چوہا چھو رہا ہو۔

"اوہ یہ قمیض!" حمیدہ بی کا سفر سے تھکا ہوا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اصغر بھائی کی ہے' بھولے سے آگئی----" انہوں نے بڑی بیوی جی کو بتایا۔

سکھا ایک دم مسکرا دیا----- اصغر میاں کی قمیض-----! توبہ اور کسی کی بھی نہیں اصغر میاں کی۔ وہی جن کی صورت دیکھ کر سارے دن کھانا نہ ملے۔

دس مرتبہ سال میں اپنی حمیدہ بی کے آگے ناک گھسنے آتے اور اپنی حمیدہ بی انہیں کبھی گنتی میں ہی نہ لاتیں سکھا ہی نہیں سارا گھر جانتا تھا کہ حمیدہ بی کو شادی کے نام سے چڑ ہے خصوصاً اصغر میاں کے تو ذکر سے ہی بھاگتی تھیں۔ قمیض کو ٹانگنے سے پہلے اس نے اسے خوب بیدردی سے جھٹکا گویا اس سے پہننے والے کا جسم ہی جھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ دو بٹن نکل کر دور جا پڑے۔

"انہیں اسی میں لگا دو-----" لڑھکتے ہوئے بٹن کو حمید بی نے جوتے کی نوک سے ٹھکرا کر کہا۔ سکھا کا دل ایک بار لپ سے اچھلا اور پھر متواتر جھکورے لیتا رہا۔ ٹھکرائے ہوئے بٹن پر ترس کھا کر اس نے اٹھایا اور واپس کاج میں پرو دیا۔

شام کو ٹینس کھیلتے وقت وہ برابر ان کی گیندیں اٹھا کر دیتا رہا۔ جب حمید بی زن سے گیند کو مارتیں تو کوئی چیز دندناتی ہوئی سکھا کے دل میں آلگتی وہ گیند کے پیچھے دوڑتا اور چوٹ کھائے ہوئے کبوتر کی طرح تلملاتی گیند کو ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی دونوں مٹھیوں میں دبوچ لیتا۔ گیند دیتے وقت وہ دونوں آنکھوں میں اس مسکراہٹ کو سمیٹ لیتا جو حمیدہ بی کے شیریں لبوں پر تھرتھرا جاتی۔

عدیا کے جھا بجھنوں کی آواز پر اس نے دھیان نہ دیا وہ چنا ہوا ساگ لئے باورچی کے پاس جا رہی تھی مگر اس کے جھا بجھنوں کے جھنکار موت کا گھنٹہ ثابت ہوئی۔ فوراً باورچی کی پسلی پھڑکی اور اسے جانا پڑا۔ کاش حمیدہ بی اس کے پھرتیلے ہاتھوں کی خدمت کا کچھ خیال کرتیں مگر نہیں۔

"جاؤ سکھا امی خفا ہو گی-----" انہوں نے آخری گیند بنا مسکرائے ہی لے لی اور وہ سر جھکائے لوٹ آیا۔ رات کو جھوٹے برتن سمیٹتے وقت اس نے حمیدہ بی کی رکابی سب سے اوپر رکھ لی۔ زیادہ برتن نہ رہیں' اس لئے نوکر چاکر عموماً ڈونگوں یا جھوٹی پلیٹوں ہی میں کھا لیتے تھے مگر سکھا کو اس سے نفرت تھی۔ وہ سوکھی روٹی تو کھاتا مگر جوٹھی رکابی میں نہیں۔ مگر حمیدہ بی کی رکابی کتنے سلیقہ سے جوٹھی کی گئی ہوتی تھی۔ ذرا سا کونہ سالن کا-----اک آلو کا ٹکڑا' دو چار نازک سی ہڈیاں بھلا کیا جھوٹی رکابی ننھے میاں کی طرح تھوڑی کہ بھر بھر چمچہ ہر ڈونگے میں سے

لے کر انبار تھوپ لیا اور شروع کر دی ترائی- جیسے نوالے نہیں بن رہے ہیں پہلوانی ہو رہی ہے' توبہ! دیکھنے کی نہ رہتی ان کی رکابی' شوربہ ٹپک رہا ہے چاول گر رہے ہیں- ہڈیاں اگال کی طرح چبا چبا کر تھوکر جا رہی ہیں- اوپر کی رکابی اس نے چوکہ پر رکھ دی اور برتن کونڈی میں ڈالنے چلا گیا- واپس لوٹا تو رکابی غائب تھی-

چوکی کے پاس عدیا بیٹھی اس میں سالن اور روٹی چور چور کر اپنی بلی کو کھلا رہی تھی-

مارے طیش کے سکھا کی صورت بھیانک ہو گئی- ایک بار ہی تو جی چاہا تو اس کاٹنے کی چھری اٹھا کر سرخ ٹول کی گٹھڑی میں آرپار بھونک دے-

"میں....... یہ.......... میری......." وہ ہکلایا-

ہونہ....... جھوٹی رکابی ہے میں نے چوکی پر سے لی ہے-----" عدیا اپنے باپ کو سنانے کے لئے چنچنائی-

"اتنے برتن دھونا پڑیں تو پتہ پڑے------ ہونہ------" باورچی کو گردن موڑتے دیکھ کر سکھا خون کے گھونٹ پی گیا-

"لے بھائی اس ڈونگے میں کھا لے- کباب بھی میں نے تو کھایا نہیں- آج کچھ جی اچھا نہیں-----" کرتہ سرکا کہ باورچی پیٹ پر ڈفلی بجانے لگا-

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا-" اس نے کڑوے کڑوے آنسو حلق میں چوس لئے اور سر جھکائے برتن سمیٹتا رہا- عدیا نے ایک بار تیکھی سی نظر ڈالی اور ڈونگوں کا سالن پیالوں میں انڈیل اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی-

"میری بلی کہتی تھی آج کا سالن بڑا میٹھا تھا------ حمیدہ بی کی جھوٹن تھی نا-----" جاتے جاتے عدیا نے طعنہ مارا- سکھا اتنا بچھورا نہ تھا جو کوئی لوٹ کے بات کہتا- پر جی چاہا مونڈی کاٹی کی تھوتھنی اسی بان کے جونے سے رگڑ پھینکے جس سے وہ قورمہ کا پتیلا مانجھ رہا تھا-

"دیکھا امی؟ منع کیا تھا پھر بھی چلے آ رہے ہیں اصغر بھائی- نفرت ہے انہی باتوں سے-" سکھا نے جھاڑو دیتے وقت بڑی بیوی جی سے کہتے سنا-

اوئی تو کیوں نہ آئے......... اللہ رکھے اس کا گھر ہے------" بڑی بیوی بولیں۔

"پر' امی میری پڑھائی کا حرج ہو گا------ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اتنی جلدی کیا مار تھی آنے کی۔ ابھی ان کے یہاں سے ہو کر آ رہی ہوں۔ حمیدہ بی جھلائی ہوئی تنتنائی چلی گئیں اپنے کمرے میں۔ بیوی جی مسکرا کر رہ گئیں اور سکھا نے دیکھا کہ حمیدہ بی کی جان کو روگ سا لگ گیا۔ فکر مند اور گھبرائی ہوئی سی رہ گئیں۔ گاڑی کے وقت تو مارے پریشانی کے برا حال ہو گیا۔ پڑھتی ہیں تو پڑھا نہیں جاتا۔ رنگ ہے کہ فق! کتاب کھولتی ہیں بند کر دیتی ہیں۔ ایک نظر دیوار پر تو دوسری کلائی پر' اگر سکھا کی دعاؤں میں کچھ گرمی ہوتی تو ریلیں لڑ گئی ہوتیں اور------ مگر ریلیں نہ لڑیں ہاں اصغر میاں کی تقدیر ضرور لڑ گئی۔ ریت کی بوریوں جیسے چوڑے چوڑے پیر مارتے۔ وہ اوپر چڑھ آئے۔ یہ ان کی عجیب عادت تھی کہ راستہ میں ہر ایک کی مزاج پرسی کرتے جاتے۔

"کیوں بے رمو....... کلف ٹھیک نہ دیا اب کے کالروں میں تو مارے جاتے....... الو کر دوں گا......"

"اوہو سلام علیکم باورچی کیسے ہو....... میں تو کہتا ہوں یہ قولنج کے دورے نہیں۔ قورمے کے ہیں۔ کھانا کم کر دو۔"

"سلام بڑی بی----- ارے کیا ہو تم بھی شادی وادی تو کراتی نہیں۔"

"ارے میاں جب کہو جب کرا دوں۔"

"چار سال سے خاک چھنوا رہی ہو------"

"اے بس میاں امتحان ہو لیں----"

لعنت امتحانوں پر----- کہاں ہیں ------ کیوں بے سکھا بڑا اِلمڈ حییک ہوتا جا رہا ہے----" وہ ہمیشہ اس کے چپت مارنے کی کوشش کرتے۔ مگر سکھا غوطہ مار کر صفا وار خالی دے جاتا اور جب وہ آگے نکل جاتے تو اس کا جی بے اختیار مجرمانہ افعال کی طرف راغب ہوتا۔ چاہے کالا پانی ہو' چاہے پھانسی۔ بس ایک دفعہ

کس کر ان کے موٹے کولھوں پر ایک لٹھ نکا ہی دے۔ واپس جاتے وقت اصغر میاں سب کو انعام دیتے۔ اس لئے سارے نوکر انہیں سلام کرنے برساتی میں جمع ہو جاتے مگر سکھا کو عموماً" اس وقت کوئی ضروری کام لاحق ہو جاتا۔ رخصتی سلام صاف بچا جاتا اور اگر وہ اس کے نام کی اٹھنی کسی کو دے جاتے۔ تو وہ اسے زمین پر ڈال کر اس پر تھوک دیتا۔

"سکھا، اصغر میاں پوچھیں تو کہہ دینا میں سو رہی ہوں۔" حمیدہ بی نے سکھا سے رازدارانہ انداز سے کہا اور جونہی حمیدہ بی کا نام آیا وہ چلا چلا کر کہنے لگا۔

"صاحب! سو رہی ہیں حمیدہ بی-----" مگر اصغر میاں مست ہاتھی کی طرح جھومتے کمرے میں گھس گئے اور حکم چلانا شروع کیا۔

"چلو سیدھی طرح ٹینس کھیلو۔"

"اللہ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو لاؤ ہم ابھی اچھا کر دیں-----" مگر حمیدہ بی ان سے بچ کر دور کونے میں جا کھڑی ہوئیں۔ لاکھ خوشامد کی مگر کمبخت نہ پسیجا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لایا۔

یہی نہیں۔ وہاں تو حمیدہ بی کے حصے کا چین ہی اڑ گیا۔ حمیدہ بی چپکی بیٹھی کھانا کھاتیں مگر اصغر میز کے نیچے سے پیر ڈال کر ان کی پنڈلیوں میں چٹکیاں بھرا کرتے سکھا خاموش خون بھری آنکھوں سے ان کے اژدہے جیسے پیر کو میز کے نیچے رینگتا دیکھا کرتا۔ کاش اس کا بس چلتا تو وہ اس منحوس اژدہے کو پھن کچل کر اسے چولھے میں دبا دیتا اور جب دھیمے دھیمے سلگ کر راکھ ہو جاتی تو اس سے اپنے سارے جھوٹے برتن چمکا ڈالتا۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ ڈرائینگ روم میں وہ صوفہ جھاڑنے گیا تو اس کا دل لرز اٹھا۔ حمیدہ بی اپنے گھٹنوں میں منہ دیئے سسکیاں بھر رہی تھیں اور وہ انسانی گینڈا پاس کھڑا----- "تمہیں ہماری قسم-----" کہہ رہا تھا۔ سکھا کو بھونچکا دیکھ کر وہ کھسیا سے گئے اور ڈانٹا۔

"ابے چل یہاں سے-----" مگر سکھا نہ ہلا۔

"نہیں------مت جا سکھا------" حمیدہ بی نے منہ اٹھا کر کہا۔

"میں کہتا ہوں------ابے سکھا کے بچے------ جاتا ہے کہ......"

"خبردار جو سکھا تو گیا....." حمیدہ بی نے پیار سے ڈانٹا------- سکھا پتھر کے بت کی طرح جم کر کھڑا ہو گیا------ اصغر جیسے سو پچاس بھی آ جائیں تو اگر حمیدہ بی حکم نہ دیں تو وہ چٹان بن کر ڈٹ جائے۔ چاہے وہ اس کی لاش کو کچلتے جائیں مگر۔

"اچھا------ یہ بات ہے تو ------ خیر------" اصغر میاں سکھا کے آہنی ارادے سے ہار کر حمیدہ بی پر حملہ آور ہوئے مگر وہ ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی اپنے کمرے میں غائب------ دروازہ بند------!

رات کو جب تھکا ہارا سکھا پلنگ پر لیٹا تو بان کا ہر تار بچھو کے ڈنک کی طرح اسے ڈسنے لگا۔ جسم نیند کے لئے مچل رہا تھا---- پر نیند کہاں؟ وہ پریشان تھا اور یہ پریشانی بے بنیاد نہ تھی۔ حمیدہ بی دن بدن روہانسی اور چڑچڑی ہوتی جاتی تھیں۔ اور آج تو وہ رو رہی تھی۔ وہ کمبخت کھڑا رلا رہا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے وہ ہر وقت ڈری ہوئی فاختہ کی طرح چھپتی پھرتی تھیں۔ حمیدہ بی! وہی نا جنھوں نے اس دم املتاس کے پھولوں کا گچھا بالوں میں لگا لیا تھا تو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کالی رات میں تاروں کے گچھے جگمگا اٹھے ہوں۔

اس نے زور زور سے اپنی کھردری ہتھیاں جھلنگے کی پٹی پر گھسیں کاش وہ ان میں مچی ہوئی کھجلی مٹا سکتا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اصغر میاں کے جسم پر سے وہ سبز دھاریوں دار قمیض کھینچ کر اتار لی ہے اور اب ان کی کھال بھی کھرچ رہا ہے کانٹا لے اس نے انہیں مسلم کی طرح گودنا شروع کیا۔ چوڑے کندھے موٹے موٹے بازو' رانیں پنڈلیاں اور پرنچی مرغی کے رنگ کے تازہ شیو کئے ہوئے گال' وہ برابر نمک مرچ اور لیموں لگا لگا کر ننھے ننھے خون بھرے گڑھے بناتا رہا۔ پھر دانت کچکچا کر ایک بار ہی ان گستاخ آنکھوں کا کانٹوں میں پرو کر سر کے میں ڈبو دیا۔ اس ذہنی قتل کی دہشت سے وہ بالکل تھک گیا۔ جسم کو سیدھا ڈال کر وہ جھولے میں دبک گیا۔۔ رات بھر وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہا۔ اس کا ہمزاد اسکیمیں بناتا

اور ان پر عمل کرتا رہا۔ کبھی حمیدہ بی کو اژدہوں سے بچا رہا ہے۔ کبھی دریا کی بڑی بڑی لہریں منہ پھاڑے لپکی چلی آ رہی ہیں۔ مگر وہ موٹر جیسی تیزی سے انہیں بچا لے جاتا ہے۔ بڑے بڑے کالے پستول لئے ڈاکو آدھے منہ پر ڈاٹھا باندھے حمیدہ بی کے کمرے میں جھانک رہے ہیں اور سکھا ان سے بھڑا جا رہا ہے اور پھر بچاؤ بی کو وہ صابن کے جھاگوں کی طرح دونوں ہاتھوں کے چلو میں ہلکے ہلکے دھواں بنتے دیکھتا---- وہ غائب ہو جاتیں۔

"ہات تیرے کی-----" اس نے چاہا زور سے چلا کر کہے مگر وہ چپ ہو گیا---- حمیدہ بی کچھ بگڑی روٹھی سی اپنے کمرے سے نکلیں اور عدیا کو پکارنے لگیں۔

"جی------- صاب۔" سکھا حسب عادت بولا۔

"تم نہیں عدیا----" سکھا کا منہ اتر گیا۔ باوجود کوششوں کے وہ عدیا کی ضرورت کو دنیا سے نہ مٹا سکا۔ اس کا خون تیل کی طرح کڑکڑانے لگتا۔ جب وہ اسے حمیدہ بی کے بنجی کپڑے دھوتے وقت انہیں کیچڑ میں سانتا دیکھتا۔ اس وقت بھی جب جماہیاں لیتی گنگناتی عدیا چنیا بطخ کی طرح ٹانگیں مارتی آئی تو سکھا بھلس کر رہا گیا۔

جان بوجھ کر اس نے کپڑے تین دفعہ گرائے اور انہیں بجائے ہاتھ میں اٹھانے کے پیروں سے گھسیٹتی غسل خانہ تک لے گئی۔ سکھا کا دل گھٹتا چلا گیا۔

"ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں-----" وہ غرایا۔

"ارے تم کون جمعدار جی---- ایسی لے جائیں گے۔"

"مئی دھو----- مجھے دے-----"

"نہیں------ تمہارے دھونے کے نہیں ہیں۔"

"بکے مت ری------"

"لو....... لو....... لو------" عدیا نے ناگن کی طرح بھنکار کر سارے کپڑے وہ سہا ہوا کپڑے سمیٹ ہی رہا تھا کہ حمیدہ بی لرزتی کانپتی نکلیں----- وہ! وہ

جلدی سے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا---- عدیا نے نتھنی کو معنی خیز کھٹکے سے ذرا اچکایا اور مسکراہٹ روکتی' ناک بجاتی کپڑے سمیٹ چل دی۔

اس دن سکھا سارا دن خوفزدہ اور سہما ہوا رہا۔ وہ کبھی حمیدہ بی کو دیکھتا کبھی اصغر میاں کو---- اور کبھی عدیا کو لیکن تینوں کے پاس سے اس کی نظریں لاجواب لوٹ آتیں۔ جھاڑو دینے کے بہانے سے اس نے اصغر میاں کی جیبیں ٹٹولیں مگر وہاں تو سوائے ناخون کاٹنے کے چاقو کے اور کچھ نہ ملا۔ اصغر کی نیت خراب تھی۔ کیا عجب جو جانے سے پہلے کچھ کر بیٹھے۔ سارا دن وہ کسی نہ کسی بہانے سے ان کی پیچھے لگا رہا۔ دو ایک بار اصغر میاں نے شبہ سے دیکھا۔ مگر اس نے ایسی صورت بنا لی جیسے کچھ ہو ہی نہ مصیبت یہ تھی کہ وہ لوگ باتیں بھی تو انگریزی میں کرتے تھے۔ سوائے "یس" اور "نو" کے کوئی بات پلے نہ پڑتی۔ لیکن اگر دونوں کو جمع کیا جاتا تو یقیناً "نو" کی تعداد پچاس گنا زیادہ ہوتی اور حمیدہ بی کی ہر "نو" اصغر کا رنگ پھیکا اور سکھا کا تیز ہوتا جاتا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سکھا باورچن سے مسالہ کی قاب لئے باورچی کو دینے جا رہا تھا کہ پتوں میں آہٹ ہوئی اور پھر کسی نے اس کے پیر زمین میں گاڑ دیئے۔

"نو" حمیدہ بی کی تھکی ہوئی آواز آئی۔ سکھا کے جسم میں چنگاریاں سی لپکنے لگیں۔ اصغر کی بھاری سڑک کوٹنے کے انجن جیسی آواز ان کی آواز کو پیستی ہوئی گھڑ گھڑائی چاند کی پھیکی روشنی میں اس نے حمیدہ بی کا کاغذ جیسا سفید چہرہ ایک رخ کو مڑا دیکھا۔ اصغر ان کا ہاتھ پکڑے کھینچ رہا تھا اور وہ بل کھائے جاتی تھیں۔

"آہ!" حمیدہ بی کے منہ سے آخری بار نکلا اور پھر اصغر نے ان کا منہ بند کر دیا۔

بھڑوں کا چھتہ کانوں کے راستے سکھا کے دماغ میں گھس گیا۔ دوسرے لمحے میں وہ ان کے سر پر تھا۔ بھاری مسالہ کی قاب اس نے پوری طاقت سے اصغر میاں کے سر پر دے ماری اور چاروں شانے چت دچکا مار کر سینے پر چڑھ بیٹھا مگر ایک دم ہی اس کے اُوپر اُونچی ایڑی کے جوتوں اور تیز ناخونوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے برس

پڑے۔ بدحواس کتے کی طرح وہ جھاڑی میں جسم کو کھرونچے لگاتا اندھا دھند بھاگا۔

"یہ ۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا تھا؟" اس نے اصغر کو کہتے سنا۔

"نہ جانے ۔۔۔۔۔۔ دماغ خراب ہے، پگلے کا ۔۔۔۔۔ آپ کے چوٹ تو نہیں لگی۔"

دوسرے دن صبح جب عدیا چائے لینے باورچی خانہ میں گئی تو نل کے پاس موٹی سی گردن کا سانڈ جیسا مردوا بیٹھا برتن مانجھ رہا تھا۔ اللہ جانے اس نے کیا کہا کہ وہ سہمی ہوئی باورچی کے بالکل پاس جا کھڑی ہوئی۔ "کتنا دھواں ہے باپ رے باپ!" اس نے کیل پر ٹنگی ہوئی پیلی بنیائین دیکھ کر ٹول کے سرخ دوپٹے میں آنکھیں چھپالیں اور باہر بھاگ گئی!

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ ادبی تالی بجانے کے لئے بھی دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرف عام میں ان ہاتھوں سے ہمارا مطلب ادب کے ہیرو اور ہیروئن سے ہے۔ یوں تو ایسا ادب بھی ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں۔ وہ ادب بھی ایسا ہی ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیر کے تلوے کی مدد سے تالی بجا دی ہو۔ ایسی تالی بج گئی مگر کتابوں کی جلدوں ہی میں گونج کر رہ گئی۔ عوام تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستو بن کر حلق میں پھنس جاتا۔

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بندر بندریا کو ڈگڈگی کی بجا کر نچانا پڑتا۔ ویسے اگر وعظ کرنے کھڑے ہو جائیں یا حالات زمانہ سنانے لگیں تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھئے نا محکمہ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کترا کر نکلتے ہیں۔

لہٰذا جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی۔ ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سے ایسی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ کچھ احساسات کو پھسلایا' کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبہ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت' دلچسپ اسباق کو حاصل ہے۔ ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہئے کہ بچے اس میں گلی ڈنڈے اور کبڈی کی رعنائیاں پا کر متوجہ ہو جائیں۔ ادب کا کچھ یہی حال ہے۔ کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دیجئے۔ لوگ واہ واہ کر کے نگل جائیں گے۔ رامائن اور مہا بھارت کا زمانہ کیوں ادب تک کل کی بات بنا ہوا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے

قرآن کی مدد سے پردہ کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن "شریر بیوی" نے کونین کھلا کر اور "کولتار" نے علقوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے، صرف بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے اونگھ رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی، ادب اور سماج، ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیروئن کو الگ کردیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

ہیرو سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن "جام جم" کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈال کرہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانہ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ہو یہ ہے کہ اس وقت جو قابل ذکر عورت تھی، وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دلچسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا شریف بیویاں گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولہے سے سر مار رہی ہوں گی۔ سڑی بسی، بے ڈھنگی خادمائیں جن سے اکتا کر لوگ طوائفوں کی آغوش میں سکون دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے، یہ طوائف اتنی بازاردا ور کاروباری قسم کی نہ تھی۔ وہ بالکل شریف زادیوں کی طرح رہتی مگر شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی، ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغ عام کی سی تھی جو عوام کے چندے سے عوام کی خشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ باسلیقہ بیوی شاندار مکان میں پھولوں سے لدی اور عطر میں بسی ہوئی رکھ سکے۔ لہٰذا اس نے ان کا نہایت آسان علاج نکالا۔ گھر میں تو بیوی رکھی کہ علاوہ نسل بڑھانے کے دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی رہی۔ اور بازار میں طوائف جو جذبات کی پال پوس کرتی رہی یہ بڑا کارآمد انتظام

ثابت ہوا۔ گھر بھی رہا اور رنگینیاں بھی۔
مگر طوائف کی سوکن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں۔ اگر میاں سکون روح کے لئے طوائف کے ہاں گئے تو وہ بھی محلہ ٹولہ میں آنکھیں لڑانے لگی۔ مجبورا . وہ شوہر جنہیں "باغ عام" کی سیر ذرا مہنگی پڑتی تھی۔ واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے۔ سوچا کہ چوراہے کی ہانڈی سے تو "اپنی دال روٹی" ہی بہتر ہے' عورت بھی کچھ شیر ہو گئی۔ اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا۔ جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے۔ آہنسا کی پالیسی کے ماتحت طوائف کے در سے بھیک مانگ کر عزت اور توجہ حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار کی فتح مند طوائف کو شکست دے کر پریم چند کی گرہستن دبے پیر گھونگھٹ کاڑے' قدم قدم پر پیر جھومتی' ماتھے ٹیکتی' ادب میں رینگنے لگی۔ باغ عام کے سیلانے اپنے ہی گملے میں چھوئی موئی کا کلہ پھوٹتے دیکھ کر کچھ متحیر' کچھ مغرور' اسکی سینچائی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر تھی ہی مگر یہ میٹھی میٹھی' معصوم سی بے ضرر چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ طوائف کا پلہ اچک گیا۔ اس کی خوبیاں عیب ہو گئیں۔ وہی ناز و ادا جس کی تلاش کی ناکیں رگڑنے جاتے تھے۔ رنڈی کے چھل بن گئے۔ چوراہے کو گندہ کہہ کر لوگوں نے اپنے ہی گھروں میں کوئیں کھودنا شروع کئے۔ مگر یہ کنوئیں روز بروز گہرے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کنارے ہاتھ چھوٹ گئے۔ اور ڈوبنا پڑا۔ طوائف جھلائی' بہت بگڑی مگر تاج سدا ایک کے سر نہیں رہتا۔ نا عاقبت اندیش نے پھل تو کچے پکے خوب کھائے مگر نئی پود نہیں لگائی اور ادھر معصوم گھونگھٹ والی نے نئی پود بھی لگائی اور پرانوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میٹ کر گرہستن نے دنیا بنانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چڑھ گئی۔ وہی ایڑی تلے کچلنے والے مرد کی حمایت میں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہرہ عام پر پٹخ دیئے۔ وہ خود تو غیر جانبدار رہی۔ نہ کسی سے لڑی نہ بھڑی آہنسا کی قائل۔ مگر جیسے گاندھی جی برت رکھ رکھ کر گورنمنٹ کو بوکھلائے دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جھکی جھکی آنکھوں سے'

نقاب کے پیچھے سے حشر برپا کرنے لگی۔ لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ طوائف کے بعد فیشن ایبل میم یا پارسن نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا گھیرے رکھا۔ ادب کی اس قسم کی ہیروئن نے ہر کہانی اور ہر قصہ میں گھسنا شروع کیا۔ مگر وہ جس نے طوائف کو مار بھگایا۔ اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کرلیا مگر گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ مرد مجبورا. اسے گھر میں بند کر کے اکیلا باہر جاتا ہے۔ مگر وہاں وہ اکیلا رہ نہیں سکتا۔ وہ سیدھے ہاتھ چھڑی اور الٹے ہاتھ میں عورت چاہتا ہے۔ تقویت دل و دماغ کے لئے گھر میں رکھی ہوئی معجون دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی ہے' لہٰذا وقتی گزارے کے لئے اس نے دفتر ہی میں دور بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ کبھی کبھی نظر آجانے والی مینجر کی حسین لڑکی اور ایسی یہ اکا دکا ہیروئن ڈھونڈ کر جسم ناپنا شروع کردیا۔ اس نے کے جواب میں "گوڈر کا لعل"۔ "روشنک بیگم۔" "زہرہ بیگم" کی ہیروئن کو دیکھ کر ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابری جاری رہی اور جیت آخر میں اس کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ------ اس نے تو بالکل ہی طوق گلو بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اور بڑھی پہلے تو گھر کی چار دیواری میں رشتہ کے بھائیوں ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کردی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کے اندر کشتیاں پچھاڑنی شروع کر دیں۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ چھپے ڈھکے جلوے اور بھی زیادہ گدگدانے لگے۔ طوائفوں کے نخرے پرانے اور پریم چند کی آہنسا کی قائل مقدس چیلی' بیوقوف اور بزدل نظر آنے لگی۔ اس کے کنگلے پن سے جان جل گئی۔ جتنا بھی وہ ناک رگڑتی گئی۔ اس سے نفرت ہوتی گئی۔ یہاں تو اب صرف وہ ہیروئن پیر جما سکتی تھی جو منہ کا نوالہ اچک لے۔ بھڑوں کا بجتہ منہ اوندھا دے۔ بجائے میٹھی میٹھی نظروں کے کونین میں بجھے ہوئے تیروں سے کام و دہان کی تواضع کرے۔ پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر وقتا. فوقتا. تھپڑ اور چانٹوں سے گال سینک دے۔ تنخواہ کم 'گذر مشکل لیکن اگر ایسی شوخ شلیسہ بیوی ہو جو سارے دکھ

درد چٹکیوں میں اڑا دے۔ تو پھر جنت کی آرزو میں مرے۔

مرد، عورت کے ظلم سہنے کیلئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جنت میں بھی رہنے کو تیار نہ ہو سکا۔ حضرت آدم نے بیٹھے بیٹھائے پسلی چیر کر اس فتنے کو نکال ڈالا اور سر پر سوار کرلیا۔ خواہ بیوی ہو یا رنڈی جو لگام پکڑ لے۔ ہنکے چلے جائیں گے جتنے کوڑے زیادہ پڑیں گے۔ چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ دل کے ساتھ وہ قول و فعل کی بھی چوکیدار بن بیٹھی اور دماغ کی پاسبانی شروع کردی۔ سانپ کے منہ چھچھوندر بن گئی جو نہ گلی جائے نہ تھوکی جائے۔ چھتری، ٹوپی اور برساتی کوٹ کی طرح ساتھ ٹنگ کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ مرد چیخ اٹھا۔ سب سے پہلے پطرس قبولے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر دہائی دینے لگے۔ ادھر چچا چھکن، منشی جی، مرزا جی اور ہزاروں جی بھی پکار اٹھے۔

"یہ زیادتی ہے بیگم! ہمیں ہنساؤ مگر نہ اتنا کہ پیٹ میں درد اٹھنے لگے۔"

ادھر ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی۔ اس نے یہ راز بھی معلوم کرلیا کہ اگر وہ ذرا دبی ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں۔ کیوں نہ یہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کردی جائے۔ لہٰذا محلہ ٹولہ کی سلائی سے شروع کرکے اقتصادی بازار کے ہر کونے میں رینگنے لگی۔ اس نئے روپ نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ ویسے عورت بھیس بدل کر آئے۔ تو خود اس کا میاں اس پر عاشق ہوجاتا ہے۔ جب ٹمانے نکلی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے۔ عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ ملا جی ہکابکا منہ پھاڑے رہ گئے۔ عورت ڈاکٹر بن گئی۔ حکیم مارے حیرت کے پلکیں جھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالفت کو بوکھلاہٹ کے مارے کھانسی کے دورہ پڑگیا۔ "ہٹو! بچو! عورت آرہی ہے!" لوگ گھبرا کر الٹ گئے اور دھڑا دھڑ میدان مارنے لگی اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا وہ دل کی دنیا کو کیوں نہ تاراج کرتی۔ لہٰذا ہر طرف تباہی مچادی۔

تو ---- یہ کماؤ ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند' بالکل لیٹروں کی طرح چاروں ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہوگئی۔ خیر کونین کھلاتی تھی تھپٹر لگاتی تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے چوکیداری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر ٹسوے بہانے لگتی تھی ۔ ہمزاد بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا؟ تھی تو اپنی دست نگر اپنی بلی بھی کبھی پنجہ مار بیٹھتی ہے مگر خر خر کرکے پھر اپنا نرم گرم جسم پیروں سے رگڑ کر منا بھی تو لیتی ہے۔ فیشن بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے کیا۔ ہے تو اپنی۔ ہمیں سے تو مانگ کر اتراتی ہے۔ ہماری ہی جیبوں سے تو اٹھلا اٹھلا کر پیسہ نکالتی ہے' لیکن یہ بالکل مردانہ' اور اقتصادی دنیا خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کہہ کر کھسوٹ لے جاتی ہے یہ تو سراسر ڈاکہ زنی ہے ----- صاف دھوکہ!

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی ہی ہیروئن ڈائن بن گئی۔ بہت سمجھایا۔ صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خود سر اور خود مختار عورتوں کا بڑا بد انجام ہوتا ہے۔ حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جنم میں تھوکتی ہے دفتر میں کلرک بہکا لے جاتے ہیں ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگا دیتے ہیں۔ سکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی ۔ "اسکول میں ہر لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے۔ پڑھنا لکھنا اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو' ڈوب نہیں مرتے۔" یہ ماسٹر دیکھنے میں کھٹائی جیسے چمرخ مگر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پر سوز عشق اور عبرتناک انجام سے پر نظر آئے گی۔

یقیناً . یہ ادب بھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور ہیروئن واپس پتی کے چرنوں میں سرنگوں دھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں نہ جانے کیوں لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہوگئی۔ اگر ایک گریجویٹ بیس روپیہ کماتا تو لڑکی ایک سو بیس مار لیتی۔ جوں جوں تعلیم نسواں کارآمد ہوتی گئی۔ تعلیم مرداں فضول اور بیکار بنتی گئی۔ ہیروئن نے پیر مضبوط جما دیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کش مکش

شروع ہو گئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑھی مگر اس تیزی سے نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی عنقا سمجھی جاتی تھی۔ اب گلی گلی گریجویٹ اگ آئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لئے کم از کم "آئی سی ایس" یا "پی سی ایس" تو ہو۔ کاش گورنمنٹ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا تقرر کرتی۔ تو یہ مصیبت کیوں نازل ہوتی - یہ گنے چنے افسر تو اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی وہی لے اڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گورنمنٹ آفیسر برسیں اور وہ سمیٹ لیں۔ مختلف شعبوں میں نوکر ہو گئیں۔ اس سے یہ نہیں کہ سمجھنا چاہئے کہ افسروں کی تعداد کم رہی تو کلرک بدقسمت اسکول ماسٹر ناکام اور اجڑے ہوئے ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے وہ تو اور بھی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بچاروں کے پاس دو راستے رہ گئے۔ یا تو جاہل لڑکیوں سے نصیبہ پھوڑ لیں۔ یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کرکے زندگی ان کی یاد میں گذار دیں۔ جنہوں نے دل پر پتھر رکھ کر سر پھوڑ لیا۔ان کی روحیں بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکا کیں۔ زندگی بھر ہم خیال و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں کچوکے مارتا رہا اور جو زیادہ ہمت والے تھے۔ وہ پاس پڑوس کی کبھی کبھی نظر آجانے والی اپ ٹو ڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگنے لگے۔ آخر الذکر تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اور مرد پیدا ہوتے گئے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ "موزوں رشتہ" کے لئے! بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑوں کے گٹھر پڑے سڑ گل رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہیں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیاں اور کھانوں کے انبار موریوں میں لنڈھائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھرتے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کرکے بیچ میں چال چلن کے پہریدار بیٹھائے دیئے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ

گئیں- ادھر لڑکے حیوان بنتے چلے گئے- نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی مفلوج اور غیر انسانی بنتی گئی- اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کا چھپی ڈھکی غلاظتوں کی کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا- اس نے جو پہلا کام کیا- وہ تخریب تھا- بوڑھے گھنے ہوئے پیڑ کا تنا اکھاڑے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے- پرانے مکان کو ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں- سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا- اس سے مڈ بھیڑ ہوئی- چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری تھی- گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ ہی پاسبانوں نے- لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا- گرہست ہیروئن کے راج میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی- ناقدری اور پھٹکار نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا- کچھ دیوالیہ ہو کر نکاح کر بیٹھی تھیں- کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں- کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھیننے کے لئے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا- آج اس نے بھینکے ہوئے آنچل میں چھپانے کی کوشش کی تھی- کبھی گرہستن نے اس کے ہتھکنڈے اور بناؤ سنگھار چھینے تھے- آج اس نے گرہستن کی بیچارگی اور بے کسی کی آڑ لی- سوائے بالکل نچلے طبقہ کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا- اور جب یہ باغی طبقہ طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا- طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی- بلکہ بھوکی کمینی بلی بن گئی تھی- سوائے فقیروں اور یکہ تانگہ والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا- اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعروں میں پیرو ڈالا قصیدوں میں گوندھ کر، ناولوں میں سجا کر ادب کو اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کے لوٹ کر خبر بھی نہ لی- گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کوئیوں کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی- اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں لٹکائے ہانپ رہے ہیں- یہی نہیں بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے مگر یہ اندھا کنواں دوبارہ کار

آمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا۔ چنانچہ باغی طبقہ اس کی حمایت میں
چیخ پڑا۔ پکار پکار اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بج اٹھا تھا۔ غریب
مگر خود دار جوان کو سارا حسن اور تمام لطافتیں اس نکھیاتی اور فقیرنی میں نظر
آئیں جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھی مگر جو اسے مل سکتی تھی۔
ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس
نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی۔ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ
جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ صرف نک چڑھی، خود غرض اور جھوٹی
مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گالی اور عشق کو گھناؤنا سمجھتی ہے جو محبت
کرنا ہتک سمجھتی ہے اور مرد کی حفاظت اپنی توہین۔ اس میں عام طوائف جیسی
گندی بھیانک جاذبیت کہاں؟ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے
آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ
پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے۔ اس کی گندگی
اور غلاظت گھن کھانے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں
نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بے چاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔
اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی۔ طوائف گندگی اور
بیمار، کمینی اور جعلساز ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت
کی یوں بے قدری کرتا ہے، نئے ادیبوں نے طوائفوں کا حال لکھ کر بے شک ایک
متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا ہے جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبعتوں پر
برا اثر ڈالا۔ مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے تھوڑے بہت دکھ مٹ
جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف بھی ذلیل ہو ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے،
اسے سڑا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے جو دنیا کے ہر
دکھیارے کا سہارا ہر بھوکے کا دسترخوان ہے۔ بیشک عورت نہیں مگر اس سے بھی
زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے
اسے کیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہو رہی یا بیوائیں بن بیاہی سوکھ رہی ہیں یا میاں

عورت مٹے یار ہے دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال لڑائی کی وجہ سے وکٹوریہ گارڈن میں عمدہ بیج نہ بوئے جاسکے۔ اس لئے اس سال تختہ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے۔ آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونا چاہئے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک' عریاں اور مکروہ کہے زمانے نے اسے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی انیٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

تو یہ ہوئی ہیروئن' سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عیش کرنے کے' کسی بات کی فکر نہیں ----- میں غلط کہا۔ ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فارغ البالی کا' پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ' یہ زمانہ ہے اقتصادی کشمکش کا اور سدہار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو ----- یہ ہنس گئے اور ہنسا گئے۔

چمڑی میں مگن' نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادھو کی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے آنے جانے والوں سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونروں کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں۔ مس حجاب کی بیوقوف کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہوں سے ڈر کے بے ہوش ہوجانے کے اور کچھ نہیں آتا۔ جہاں حسن و عشق کی بناوٹ نے الو بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے عاجز آکر اونگھنے کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت' بیدی کی کاروباری ہیروئن۔ منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی۔ عصمت کی بے چین' منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی ستیارتھی کی خانہ بدوش عسکری کی فلسفی میم صاحب ----- یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا کچھ تعمیر کرنے کے لئے جدوجہد کا - کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے لئے۔ دین و دنیا کو تلپٹ کردینے کا جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر

ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جاتا ہے۔ آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم۔ بلکہ صرف ایک عورت ہوگی اور اہرمن و یزداں کے بجائے ادیب اسے عورت کا رتبہ بخشیں گے پھر تعمیر شروع ہوگی۔
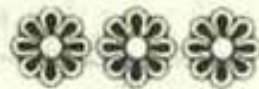
باورچی

میرا باورچی----- کاش ان غرور میں ڈوبے ہوئے الفاظ کو منہ سے نکالنے سے پہلے انسان اتنا سوچ لے کہ یہ دنیا فانی ہے! مورکھ! یہاں کوئی کسی کا نہیں- دو دن کی چاندنی اور پھر گھور اندھیرا ہے- میرا تیرا کچھ نہیں تو پھر باورچی جیسی ناپائدار ہستی جو چلتی پھرتی چھایا ہے- آج یہاں کل وہاں...... کسی کی کیسے ہو سکتی ہے بیٹے! آج مزے سے قورمہ متنجن اڑا رہے ہیں- ابھی ابھی یہ سوچ رہے ہیں کہ اتوار کو جو دوستوں کی دعوت کی ہے- اس میں شاہی ٹکڑے اور فرنی کافی ہو گی یا دو چار انگریزی مٹھائیاں بھی بنوا لی جائیں' باورچی تو ہے ہی' کیوں نہ لوگوں پر رعب ڈال دیا جائے- لیکن اچانک اطلاع ملتی ہے کہ باورچی کو شریف بامروت اور پیارے ہمسائے نے پانچ روپیہ زیادہ دے کر ہضم بھی کر لیا- جیسے چیل جھپٹا مار کر بچہ پنجوں میں دبوچ لے جاتی ہے اور غریب مرغی آہ و زاری کرتی رہ جاتی ہے بالکل اسی طرح بیکس و لاچار بدمذاق ہوٹلوں کے رحم و کرم پر زندگی کے دن گزارنے لگتے ہیں-

"میرا باورچی.... جی میں نے غلطی کی.... کاش میرا.... بھی کوئی باورچی ہوتا- یہاں اس گھر میں جس کا کرایہ میں ادا کرتی ہوں- بیشک ایک جناتی قسم کا باورچی رہتا ہے-

جس کی ملکیت توا' چولھا وغیرہ ہے اور اس کے علاقہ میں چمٹا' پھکنی اور جھینگروں' چوہوں وغیرہ کے علاوہ دو نہایت غیر اطمینان بخش قسم کے انسان بھی رہتے ہیں اور اپنی خود داری کو شدید ٹھیس لگاتے ہوئے اقبال کرتی ہوں کہ ان دو ہستیوں میں سے ایک تو خود میری گناہگار شخصیت ہے اور دوسری میرے خدائے مجازی

کی- شاید پڑھنے والوں کو شبہ ہو رہا ہے کہ یہ باورچی انتہا درجہ کا گستاخ' غیر مہذب اور مرکھنا ہو گا- جی نہیں- ساری مصیبت تو یہی ہے کہ وہ خطرناک حد تک مہذب' فرمانبردار اور کم سخن ہے- لوگ کہیں گے تو پھر یقیناً میرا دماغ کچھ خراب ہے- جی نہیں- جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ تو دماغ خراب ہی ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ چھوٹا- گو اگر آپ میرے باورچی کی رائے لیں تو وہ یقیناً رفاہ عام کی غرض سے مجھے فنا کر دینے میں کسی دماغی اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دے گا-

ہاں تو کاش یہ باورچی اور دوسرے باورچیوں کی طرح ذرا بد تمیز' تھوڑا سا گستاخ اور ضدی ہوتا تو زندگی کتنی دلچسپ اور بے تکلف گزرتی- اگر وہ تھوڑا سا غیر مہذب ہوتا تو میں کتنی آسانی سے کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھا سکتی- کیونکہ مجھے اس طرح کھانے میں لطف آتا ہے- مگر کیا ہوتا ہے- جونہی میں کرسی پر آلتی پالتی مارتی ہوں' اسے یا تو جادو کے زور سے پتہ چل جاتا ہے یا اس نے بیرے کو رشوت دے کر جاسوسی پر مقرر کر رکھا ہے کہ وہ میری جا کر شکایت کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے سے سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے پشت پر ہاتھ باندھے نازل ہو جاتا ہے گویا اگر اس کی شرافت بیچ میں حائل نہ ہوتی تو اس کے پکائے ہوئے کھانے کی توہین کی پاداش میں وہ مجھے کرسی پر سے دھکا دے کر گرا دیتا- اب میں لاکھ چاہتی ہوں کہ ڈھٹائی لادے ویسے ہی بیٹھی رہوں- مگر نہ جانے کون سی مقناطیسی طاقت سے ہیجان ہو کر میرے پیر خود بخود کرسی سے پھسل کر سرنگوں ہو جاتے ہیں- اس وقت میری اتنی ہیکی ہوتی ہے کہ کچھ میں ہی جانتی ہوں احساس کمتری ایک دل ناقابل برداشت طور پر بڑھ جاتا ہے اور اپنی ہستی نہایت ناکارہ' چھوٹی اور فضول سی معلوم ہونے لگتی ہے- ساتھ ساتھ مجرم کی طرح میں دیکھتی ہوں کہ میں اس چھری سے جو "صرف" مچھلی کھانے کے لئے لگائی گئی تھی- آلو کے کباب کھا رہی ہوں- میری طبعی بزدلی کہتی ہے کہ ظالم کی نظر بچا کر چھری بدل لوں- بغاوت کہتی ہے نہیں ان پابندیوں کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں- چنانچہ غلط چھری سے غلط کھانا کھانے پر نہایت استقلال سے مصر رہتی ہوں- میں ترقی پسند ہوں- کسی کی حکومت سہنا

کسر شان سمجھتی ہوں- باورچی کچھ نہیں بولتا- لیکن اس کے یہ تو معنی نہیں کہ خاموش رہتا ہے- قدرت کے بنائے ہوئے فرسودہ اصول پر عمل کر کے وہ زبان سے بولنا اپنی ہتک سمجھتا ہے- مگر اس کا جھکا ہوا سر تاسف سے ہلتا ہے- نیچی آنکھیں اس شرمناک نظارے کی تاب نہ لا کر اور جھک جاتی ہیں- کندھے نفرت اور حقارت سے متاثر ہو کر پر معنی جھٹکے دیتے ہیں- اور جس طرح بلی کو دیکھ کر چوہا پست ہو جاتا ہے- میری بھی تمام قوتیں شل پڑ جاتی ہیں- چھری، کانٹے، رسیاں تڑا کر ہاتھوں میں سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے، آلو کے کباب نہیں کھا رہی ہوں بلکہ جھک مار رہی ہوں- تھک کر چھری کانٹے کو سیدھا سیدھا پلیٹ میں لٹا دیتی ہوں- خدائے باورچی خانہ کے اشارے سے بیرا ملک الموت کی طرح پلیٹ میرے سامنے سے جھپٹ لے جاتا ہے- اور نیم خوردہ کباب کے تصور کو خون کے گھونٹ کی طرح پی کر رہ جاتی ہوں- پلیٹوں کی اس آواگون کی وجہ سے دماغ کا توازن کچھ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ بدہضمی کی نوبت پہنچ جائے- پھر بھی ایک غیر فانی بھوک طبیعت پر چھائی رہتی ہے- جب سے یہ باورچی آیا ہے- ایسا معلوم ہے میں خود اپنے گھر مہمان آئی ہوئی ہوں-

خیر اگر اتنی ہی بات ہوتی تو صبر آ جاتا- دل کو سمجھاتی کہ دنیا بھی تو ایک سرائے ہے- ہم سب مہمان ہی تو ہیں- نہ جانے کب سفر کی تیاری شروع ہو جائے- مجھے اس سفر سے قطعی انکار نہیں- لیکن یہ بھی نہیں چاہتی کہ قبل از وقت لشتم پشتم بھاگ نکلوں- خودکشی گناہ ہے- مگر میں سچ عرض کرتی ہوں کہ اگر میں اس فعل مکروہ کی کبھی مرتکب ہو جاؤں تو قانوناً" پھانسی اس بے رحم باورچی کو ملنی چاہئے- میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ جو آئے دن نئے کھانوں کے تجربے کیا کرتا ہے- انہیں سہنا میرے بس کا روگ نہیں، دنیا جانتی ہے کہ کھانا انسان کی دلچسپی کے لئے پکتا ہے نہ کہ انسان کھانے کی ناز برداریوں کے لئے، زبان کھانے کو چکھتی ہے نہ کہ کھانا زبان کو...... پھر کیا وجہ کہ یہ ظالم ایسے کھانے ایجاد کرتا ہے جو اگر بطور آتش بازی استعمال کئے جائیں تو قانون کی زد میں آ

جانے کا ڈر ہو۔ اول تو ان کھانوں کو شناخت کرنا ہی دشوار ہے۔ معلوم ہو گا' چمٹے' پھکنیاں اور بیلن وغیرہ غلطی سے پک گئے ہیں۔ خیر جب یہ غلط فہمی دور ہو گی تو پوچھئے کہ یہ کیا جس پر خوراک انسانی ہونے کا الزام تھوپا گیا ہے۔ کبھی معلوم ہو گا روئی کی ٹھوس گولیوں کو گھی مسالے میں لتھیڑ دیا گیا ہے۔ کبھی شبہ ہو گا بچوں کے کھلونے اور سنگھار کی چیزوں کو اس طرح کار آمد بنانے کی سعی فرمائی گئی ہے۔ گرانی کا زمانہ ہے نا جو کچھ بھی کفایت کی آڑ لے کر نہ ڈالا ہو کم ہے۔ اب اس عرصہ میں قوت فیصلہ بالکل مفلوج ہو چکے گی۔ کبھی تو اصلی پھلوں کو لکھنؤ کی دستکاری سمجھ کر حماقت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ اور کبھی مصنوعی کاغذ کے پھولوں کو اصلی سمجھ کر انتہائی طفلانہ حرکت سرزد ہو جائے گی۔

لوگ کہیں گے بھئی کیا باورچی ہے۔ کیا میز سجاتا ہے۔ مگر میں خوب جانتی ہوں۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے۔ بیوقوف بنانے کے لئے وہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہ جال بچھاتا ہے اور جب ہم اس میں الجھ کر قلا بازیاں کھانے لگتے ہیں تو نہایت داد طلب نگاہوں سے ہماری جملہ بدحواسیوں کو بغور نوٹ کرتا جاتا ہے تاکہ پڑوس کے تمام باورچیوں کے سامنے ان کا مذاق اڑا کر لطف اٹھائے یہ سب وہ صرف الو بنانے کے لئے کرتا ہے۔ ورنہ خود ہی سوچئے آقا اور خادم کے درمیان یہ سالی بہنوئی جیسا رو مشک مذاق کیا معنی رکھتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کا ذکر ہے کہ میز پر ایک عجیب و غریب ہیولا ایک بڑی سی قاب میں بڑے طمطراق سے جلوہ افروز نظر آیا۔ سب ایسے چوکنے ہو گئے جیسے غنیم کے پھینکے ہوئے بم کو دیکھ لیا ہو۔ نہایت ہوشیاری سے باورچی کی آنکھ بچا کر پہچاننے کی کوشش کی مگر باورچی کی آنکھ سے بچنے کی کوشش اتنی بے سود اور دشوار ثابت ہوئی جیسے دریا میں کود پڑنے کے بعد خشک رہنا۔ مجبوراً" اس کی پر معنی مسکراہٹ سے دہشت زدہ ہو کر ایسی صورت بنا لی جیسے پہچان گئے کہ کیا پکایا ہے ہمارے پیارے باورچی نے۔ اب نہایت مؤدب تکلف کے ساتھ قاب اٹھا کر ایک دوسرے کے سر منڈھنا شروع کی۔

"اوہو...... شکریہ...... مگر میرا تو پرہیز ہے...... ذرا سا لے لوں گا-----

پہلے آپ لیجئے"...... بدقسمتی سے ایک بن بلائے مہمان بھی آن پھنسے تھے۔ لہٰذا لئے گئے بیچارے۔ اب لرزاں و ترساں چاروں طرف سے دیکھ رہے ہیں کہ کس رخ سے اور کس اوزار سے حملہ آور ہوں۔ گویا قلعہ فتح کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ نیز اس میں جو سبز اور سفید پھول رکھے ہیں۔ انہیں کھا ہی جائیں۔ یا وہ صرف نمائش کی غرض سے رکھے گئے ہیں۔ یقین مانئے یہی صاحب ایک بار پورا کا پورا کاغذ جو سجاوٹ کی غرض سے لگایا گیا تھا نگل چکے تھے۔ لہٰذا قدرتاً" محتاط تھے۔ اب یہ نہیں کہ کم بخت باورچی ہر نئی قاب کے ساتھ کم از کم ایک پرچہ ترکیب استعمال تو دے دیا کرے۔ جی نہیں وہ تو نہایت مؤدب فاصلہ پر کھڑا لطف لے رہا ہے۔ جب میز پر رکھے ہوئے سب ہتھیار ناکارہ ثابت ہو کر پھاوڑوں' ہتھوڑوں اور درانتیوں کی ضرورت محسوس ہو گی۔ تب وہ نہایت معصوم اور بھولی آواز میں بتائے گا کہ بجائے پاگلوں کی طرح کشتی لڑنے کے اگر اس شے کو سیدھے سادھے چمچہ سے نکالا جاتا تو کبھی اتنی بے لگام نہ ہو جاتی۔ یہی ہوا جب وہ غریب مہمان اچھی طرح جسمانی اور دماغی طور پر پشت ہو چکے تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو وہ اس قدر جوش و خروش سے ذبح کر رہے تھے۔ وہ صرف رکابی کا پیندا تھا۔ آدمی وہمی ہیں کھانے سے پہلے ساری خود داری کو بالائے طاق رکھ کر نہایت لجاجت سے پوچھا کہ یہ ہے کیا بلا؟ جواب ملتا ہے۔

"سرکار بھوپوریاں!"

"ایں بھپوریاں...... یعنی کیسی بھپوریاں؟"

"ہوتی ہیں حضور"-----

یہ لیجئے۔ کیا جواب دیا ہے گویا کمبخت .بہوریاں بھی فلسفہ ہو گئیں جو ہم جیسے کوڑھ مغزوں کی سمجھ میں نہ آئیں گی اور صرف ان کا ہونا تو اس بات کی دلیل نہیں کہ انہیں کھانا بھی پڑے۔ یوں ہونے کو تو دنیا میں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں۔ جواب ملتا ہے۔

"سرکار مونگ کی دال سے بنتی ہیں"-----

اب بھلا مونگ کی دال جیسی شریف الطبع جنس پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ اگر ناریل کے خول چھوارے کی گٹھلیوں وغیرہ سے یہ حرکت سرزد ہو جاتی تو قابل معافی تھی مگر یہ مونگ کی دال اور اس درجہ کمبخت!

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ یہ پھوریاں نسیم، اشوک کمار، چندر موہن، دیوکارانی وغیرہ کا مرغوب ترین کھاجا ہیں۔ اب کس میں اتنی سکت رہ جاتی ہے کہ ان عظیم الشان پھوریوں کو کھانے سے انکار کرے۔ جنہیں نسیم، کرن نسیم؟ وہی پکار کی ملکہ نور جہاں پسند کر چکی ہے۔ مگر میں خوب جانتی ہوں کہ جیسے ہم بچوں کو "بی شادی" اور "ہوے" کے نام سے ڈراتے ہیں۔ اسی طرح مجھے مرعوب کرنے کے لئے یہ باورچی معزز ہستیوں کے افسانے سناتا ہے۔ جن کے یہاں وہ نوکر رہ کر پھوریاں کھلانے کے دعوے کرتا ہے اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ یہ ان بیچاروں کے سر مفت الزام تھوپ رہا ہے۔ اگر ہمارے سوا کسی خود دار اور ذی ہوش انسان کے سامنے یہ ان منحوس پھوریوں کا نام بھی لے دیتا تو آج یوں ہنس ہنس کر ہمارے سینے پر مونگ نہ دلتا ہوتا۔ بلکہ کبھی کا داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہوتا اور آج میں بجائے اپنی کم مائیگی پر ماتم کرنے کے اس کا مرثیہ لکھ کر شہرت دوام حاصل کر چکی ہوتی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تمام پڑھنے والے میرے وجود پر لعنت بھیج رہے ہوں گے۔ پھوہڑ ہوں۔ امور خانہ داری سے واقف نہیں ورنہ عورت ہو کر ایک ادنیٰ باورچی سے اس حد تک دبنا کیا معنیٰ؟ تو عرض یہ ہے کہ "میرا باورچی وہ جنس نہیں جسے صنف نازک کی نزاکت یا صنف زبردست کی طاقت مرعوب کر سکے۔ وہ باورچی ہے۔"

تلنا، پکانا، بھوننا، جھلسنا اور جلانا اس کا پیشہ، ----- کچلنا، پیسنا اور کاٹ چھیل کر نمک پاشی کرنا اس کا دلچسپ ترین مشغلہ، وہ جراح ہے، شاعر نہیں! اخلاقیات سے اسے کیا سروکار۔

مگر باوجود ان مظالم معشوقانہ کے اگر باورچی کو بخار آ جائے۔ کسی شادی بیاہ

میں چھٹی پر چلا جائے یا کوئی بے ایمان پڑوسی اسے ہڑپ کر جائے تو سارے گھر کا وہی حال زار ہوتا ہے جو شیر خوار بچے کی دودھ کی بوتل ٹوٹ جانے پر۔ بات یہ ہے کہ وہ ہمارا آقا ہے اور ہم اس کے..... معاف کیجئے گا۔ میں نے غلط کہا۔ میرا مطلب..... وہ۔ ہم اس کے۔ اوہ..... خیر جانے دیجئے۔۔۔۔

❁❁❁

لال چیونٹے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔
اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بور جھڑ کر پیڑوں پر سبز قمقمے ٹمٹمانے لگتے ہیں، دوپہریں سنسان اور اونگھتی ہوئی ہو جاتی ہیں۔ اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔
ایسی ہی ایک اجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی اور خاک آلودہ ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے۔
میں پچھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور روکھی نہ رہے۔ میری بادیہ پیمائی بے کار نہ گئی۔ اور آن کی آن میں دوپٹہ اتار، میں جھاڑ جھنکاڑ ٹہنیوں میں ہرے ہرے قمقمے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا۔ اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو......
اس سے قبل کہ میرے بھوکے دانت سبز چادر کو چاک کر کے مدہوش کن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ بسمل کی طرح زمین پر تڑپتے پایا۔
-----لال چیونٹے!
جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چپے پڑ گئے تھے۔

ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سرِیاقوت کی بوند کی طرح سیفٹی پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس ہائے توبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے تھے۔ مگر توبہ کیجئے کھوپڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بیکار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم پٹی' پیپ' خون' چپچپاتے ہوئے مرہموں سے دست و گریباں رہنا پڑا اور پکے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ زندگی کے انجن نے جی بھر کر بھرتا بنا دیا ہے۔ وہ دہکی ہوئی دوپہر دل و دماغ میں اپنی مکمل عفرتیت کے ساتھ کھدی ہوئی ہے اور اسی یاد کا واسطہ دے کر ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنسان ہو جائیں۔ للہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا۔ جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہیں......

اور آپ بھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں۔ ماشاء اللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں جو جلتی دوپہروں میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے الجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤں پیچ میں اپنا یہ پیر پھسل جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک کر دھرنا چاہئے۔ کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہوں۔ اور کیا! کون جانے؟ کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی۔ جبھی تو ایک اداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بیکاری نے اکسایا۔ اور میں بیتے ہوئے واقعہ بھول دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان سی۔ سی۔ آئی اور ریس کورس میں تہذیب اور انسانیت کا بے نظیر وظیفہ دہرا رہے تھے۔ میں بھٹکی ہوئی پچھل پائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آ جائے۔ تو یہ شام اتنی نیم مردہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غصہ کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما ہال کے آگے ڈراؤنے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی بھن گیا۔ وہ

آشوک کمار کی چٹخنی جیسی ٹھوڑی' مہتاب کے ابلتے ہوئے ہونٹ' سورن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ' وینا کا پہلوانی بازو' توبہ میری ایسی کون خطا ہو گئی۔ جس کے جرم میں یوں عذاب دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔ "ٹیکسی موڑو" میں نے جھلا کر ڈرائیور کو ڈانٹا۔ کونے پر موٹر لوٹتے لوٹتے بچ کر رک گئی۔ سامنے ایک عجیب الخلقت اشتہار لگا تھا۔ "امر ہندوستان...... اکیسپیر...... عوامی تھیٹر۔" ان تین چیزوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ بھلا امر ہندوستان کون شے ہے؟ ضرور کوئی بھوتوں کا قصہ ہو گا۔ جی مجھے بھوتوں کے قصے بہت پسند ہیں۔ پتہ نہیں کیوں! ضرور کسی ممی کے افسانہ عشق کا جھگڑا ہو گا۔ ورنہ حضرت ہندوستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہو گیا۔ اور اب تو سڑ گل کر دوسرے ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان تو بیشک بنجر ملک ہے۔ مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ میں زیادہ حیل و حجت کی قائل نہیں حکمائے اعظم کے اس بیان پر کہ ہندوستان مرچکا میں نے کبھی کا فاتحہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مر ہی گیا تو پھر واویلا سے کیا فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل' مرحوم کی روح کو اور عذاب ہو گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس سڑاندی لاش کو جھٹ پٹ دفن کر کے دھوم دھام کا نتیجہ کیا جائے اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف منہ اٹھا کر دل کو ڈھارس دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھئے کمبخت ملک کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ گو ویسے خود میں نے تو نہیں۔ مگر ہاں میرے پیارے ملک کے احمق جانثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا۔ اور بھئی کیا میں بذات خود بھگتتی تبھی کچھ ہو تا۔ ایسے کیا مجھ میں سرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی سے پھٹاک سے ملک آزاد ہو جاتا۔ ارے بھئی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد ہوتا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب لپیٹ میں آ جاتے۔ اور کیا' سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی کچھ امید ہو تو کوئی کچھ کرے بھی۔ ہاں نہیں تو' ویسے یہ اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے بچے تو عمر جیل یعنی سرکاری نوکریاں ایک سرے سے نصیب سے غائب۔ بھئی نہ تو میں ایسی حماقتوں کی طرفدار' اور نہ ہی قائل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا ہرج ہے آج "امر ہندوستان" کا ڈھکوسلہ ہی چلے۔ ارے ایسا بھی کیا ڈرنا کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے ا یکسلیسر! یعنی دیسی ٹھرا اور ایک دم تاج میں! کیا کچھ نہ معجون مرکب ہو گی! مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ میم صاحب دیکھنے میں تو خاصی ہیں پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

دروازے پر رے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سامنے دو چار نچے کھچے گنے حلیہ کے ہیولے منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین پھوہڑ قسم کی لڑکیاں پروگرام بیچ رہی تھیں۔ و منیتی کو تو میں صاف پہچان گئی۔ پرلے درجے کی پگلی ماشاء اللہ پوری آستین کا کرتہ گرمی کے زمانہ میں دانتوں سے نوچ کر نیم آستین بنا لیا جاتا ہے۔ کنارے ترپنے کی توفیق نہیں۔ اور چلی ہیں پروگرام بیچنے۔ ارے ایسا ہی تھا تو پوپٹ والا کی لڑکیوں کو بلا لیا ہوتا۔ خدا قسم ٹامیوں تک کا پڑاؤ کر ڈالیں! بارہ آنے کا پروگرام پورے ایک روپیہ میں لے کر میں تو جلدی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کمبخت ایسی بری عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر منہ اتر گیا۔ بس یہ سمجھئے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکا دکا فلک کی ستائی ہوئی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اے یہ میں نے کیا حماقت کی۔ اس سے تو "بھگت بوڑانا" ہی دیکھ آتی۔ خیر کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں۔ کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رک گئیں۔ سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر والی کرسی پر تھا۔ اور میں اس کے سگرٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجے بسم اللہ ہی غلط پردہ اٹھا تو دو چار ملگجے کپڑے پہنے اجڑے حلیہ کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ ووڈر۔ نہ جھم جھماتے کپڑے۔ بس میلی ہوئی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے کرتے۔ اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علی گڑھ کالج میں صبح ہی صبح گایا جاتا تھا۔ کیا سریلی اور

لیٹی لیٹی لے ہوتی تھی۔ کہ گاتے ہی میں جمائیاں آنے لگتی تھیں اور روز یہی جی چاہتا تھا کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکئے دے کر ہال ہی میں پڑا رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں نغمہ تیز ہوتا گیا۔ دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا کہ دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھولی ہی نہیں گئیں۔ بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جوتے مار مار کر منایا جا رہا ہے کہ "ہندوستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے۔ کہ ایک دفعہ تو بہرا کان بھی چیخ اٹھے۔ بھلا ان اللہ کے بندوں سے کس نے کہا ہو گا۔ کہ اتنی گرمی کے زمانہ میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھ دو کہ دماغ میں چڑ کے لگنے لگیں۔ اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ غریب راج ویسے ہی جذباتی ہے۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ پروگرام کا ورق الٹا۔

اندھیری گھپ اسٹیج پر لال لال بھوت اپنی پوری خباثت سے جھپٹا۔ نقارے کی چنگھاڑ سن کر سارے ساز چونک اٹھے۔ غرانے لگے۔ نفیری چیخ اٹھی۔ اور ستار جھلانے لگی۔ سازوں کی فوج پکار پکار کر انسانوں کو پکارنے لگے۔ دم بھر میں جی دار چاروں طرف سے ننگی تلواریں چمکاتے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے امنڈ کر دشمن پر الٹ پڑے۔ نپے تلے قدموں سے بڑھتے ہوئے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے۔ وہ سب کے سب نشانہ باندھ کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے۔ مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے پردا گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاحول ولاقوۃ تین آدمی تو تھے ہی اسٹیج پر اور وہ بھی ٹنڈوں جیسے سوکھے مارے، یہ میرے واہمہ نے انہیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیوں بنا لیا۔ اور تین ہی تو عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پھولے پھولے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دہک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھوآں!

جی چاہا گھبرا کر بھاگوں! مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم کے دو ٹکڑے کر گئی تھیں۔ "بھاگ یہاں سے۔" پیر کہتے تھے۔

"ذرا ٹھہر!" دل نے پکارا۔ ان اعضا کی تو تو میں میں سے ہلکان ہو کر میں اور

بھی سہم گئی۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا۔ اور بالکل ہی لرز گئی۔ پردہ گر چکا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پرت پردوں سے اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک زہریں بجھی ہوئی چمک تھی۔ اور ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ اس کا سینہ بوجھل بادلوں کی طرح ابل ابل کر دب رہا تھا۔

"راج!" میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر جلد ہی اس بھونچال سے سہ کر میں دور ہٹ گئی۔ "راج" میں نے پھر پکارا۔

"کیا طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں تو۔" اس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز کی دنیا سے واپس کھینچ کر کہا۔ "گھر چلو گے؟"

"نہیں..... اس نے ڈانٹ بتائی۔ توبہ ہے۔ لعنت ایسے تماشہ پر کہ جی ہلکان ہو جائے۔ "یہ الٹے ہاتھ پر شانتی تھا اور سامنے پریم..... میں ان سب کو جانتا ہوں۔" اس نے فخریہ کہا گویا ان سب کو جاننا ہی مقصد زندگی ہو۔

"وہ بچن شکر تھا اودے کا رشتے کا بھائی!"

"ارے وہ لمبوترا سا۔"

"وہ لمبوترا سا قطعی نہیں تھا۔" اے لو۔ راج برا مان گیا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے۔" "ضرور ہو گا۔" میں نے جل کر کہا "مگر اودے شنکر کا بھائی! خوب کماتا ہو گا۔" "وہ کچھ بھی نہیں کماتا۔ گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے۔" چالیس روپیہ ملتے ہیں۔

"روز؟..... تو اور کیا کسی کا سر لے گا۔"

"جی----- روز نہیں، مہینہ بھر میں۔"

"ارے۔ اور اودے شنکر اسے کچھ نہیں کہتا۔"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی، آہ! یہ ہونہار، یوں مٹی میں عاقبت رلا رہے ہیں۔ ارے صاحب یہی تو وقت

ہے کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں۔ اس سے تو پچھو مہاراج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے۔ بس اسی کے ذریعہ ہزاروں کما رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وہ آتش فشانی کیفیت غائب کر کے مجسم شعر بنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سرو تال پر پھدک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں۔ بلکہ یہ میٹھے میٹھے سر ان کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھائے جا رہی تھی۔ ننھی ننھی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رینگتی احساس کو ڈاکے دے رہی تھیں۔ اور راج-----؟

راج بے حس تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا وجود ناچ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں تھرک رہی تھیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا۔ کہیں کہیں یہ عوامی جمیلہ مجھے پسند نہ آجائے۔

"کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں۔" ختم ہونے پر میں نے پوچھا۔

"نوکر نہیں، یہی مالک ہیں۔"

"خیر ہوں گی۔" میں نے جل کر کہا۔ "مگر چالیس روپیہ میں تو......"

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا۔ مگر میں سوچتی رہی پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی تکونی بھینگی ہیروئن بھری پڑی ہے اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا۔ جبھی تو ہندوستان اتنا غریب ہے۔ جدن بائی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے تو اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ

تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی۔ کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے۔ کس قدر دسترس ہے۔ اور وہ کمبخت طوطے کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مجھی کو اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دے رہا ہے اور اب جسم کے پرزے اڑے اور اب اڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ پست طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا۔"

"ہنہ یہ بنوٹے ہے۔" راج نے ایک لمبا سا لکچر پھر شروع کر دیا۔ اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے معلوم ہوتا ہے۔ کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگا لی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی بار کی لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے۔

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی۔"

"یہ پریتی سرکار ہے۔" راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا سٹ پریذنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وہ کون ہے؟ میں نے کیوپڈ جیسے گھنگھریالے سر اور مونا لزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ روی دادا ہے۔ اودھے شنکر کا چھوٹا بھائی۔" اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔"

اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار دو گھڑی بعد جھانجن سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے چٹخارے۔ آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار۔ توبہ۔

ہاں تو بات کہاں سے جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال چیونٹے

مجھے احمق نہ سمجھئے میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں- پروگرام کا آخری صفحہ شروع ہوا- اختتام پر وہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں کچے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی- اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی- دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل و دماغ پر حملہ بول دیا- بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا- ہوا میں چاروں طرف سے غیر مرئی چانٹے گھومنے لگے- احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا- جونہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا- جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول کے غول بھاگے چلے آرہے ہیں-

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو- کتنی بھی اداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو- زندگی کتنی بھی سستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پرامن بل سے نہیں نکلتی-

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لئے آگاہ کر دوں- اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھئے گا- اس سے لاکھوں کا بھلا ہو گا- دیکھئے وہ جو میں نے زمانہ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں انہیں بھول جائیے- اب میری کایا پلٹ گئی ہے اور لوگوں کی فلاح و بہبودی ہی میرا دین و ایمان ہے- لہٰذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکئے- ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے- ورنہ وہی ہو گا جو رس میں ہوا اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اٹھا چکی ہیں' اٹھا رہی ہیں اور ابد تک اٹھاتی رہیں گی- اٹھئے اور ان مہذب قوموں کا ساتھ دیجئے- ورنہ یہ برسوں کی گھنی گھنائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا- یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے- عرش تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں- علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے پھینکا جا رہا ہے----- یہ لال چیونٹے دبے پیر سر جھکائے دھاری دار نیزوں جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں- آنکھ بچی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر دیں گے- یہی ناچ رنگ جو آج یہ لوگ تماشہ کر کر دکھا رہے ہیں- ایک دن تگنی کا ناچ نہ نچاوے تو میرا نام پلٹ

کر رکھ* دیجئے گا۔ اس تماشہ کے خاتمہ پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانپ دیئے جائیں اور اگر کوشش بھی کی گئی تو رہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ دو چار بچارے خوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں، بھی نہ رہیں گے۔ وہی گاڑھا گزی باہر والے ہنسیں گے۔ وائٹ اوے کا کیا ہو گا؟ ریسا مل اور بھگو مل کاں جائیں گے۔ اگر آپ یونہی سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ دیکھئے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گزر رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گویا تو اطمینان ہے کہ ان کی پہنچ اسکولوں میں نہیں اور ہمارے بچے مزے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹپٹا۔ خشک کاغذی چیتھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے جو اتنا رری چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے۔ مگر یہ نئی چال جو عوامی تھیٹر کی آڑ لے کر چل رہے ہیں کافی سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھچھورا پن دیکھئے ان کا۔ تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولہ بنا کر نچانے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے رقص دیوتاؤں کی ودیا ہے کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا گھور بنانے کے لئے پست کیا جائے۔ "امر ہندوستان" میں صاف ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے اور چٹکیوں میں ہندوستان کا سودا کر بیٹھے حالانکہ میں نے آٹھوی جماعت میں صاف صاف پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً" قسمیں دے دے کر ہندوستان ان کے سر مڑھ دیا گیا۔ سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ کتنی شریف اور راست باز قوم ہے۔ ہندوستان کی خاطر یہ لوگ کیا دکھ نہیں اٹھاتے۔ حضور گورنر

جنرل اپنا اچھا خاصہ ملک اجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں- یہ کیا کچھ کم ہے اور پھر پارٹیاں کھانے اور گوٹے کے ہار پہننے کے لئے کتنی کتنی دور جانا پڑتا ہے- بیچاری ملکہ وکٹوریہ تو خود دلی تک آ گئیں- چیلوں کے بیٹھنے کے لئے اپنا مجسمہ تک لگوا دیا اور اس سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے- خاص طور پر اسے ضدی ملک کے لئے جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں- اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مر گئے مگر کاہلوں سے اتنا نہ ہو سکا کہ کما کھاتے- اور تو اور سنا ہے ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی- کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے؟ بھئی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے تو آپ کو بھوک لگے گی' کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کنوئیں کے پاس اور وقت کی پابندی تو ہم ہندوستانیوں کو کبھی آئی اور نہ آئے گی- وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے اور بھوک مر جانے سے آدمی آپ ہی مرے گا- اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جایئے گا- خواہ مخواہ ان لوگوں کی بدمذاقی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی- یہ حاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے- کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور ان کے کلیجے میں آگ لگی' اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں ہی کو بدنام کرتی ہے- لوگ انہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں- اب یہی دیکھئے نا اس ہزار کے نوٹوں والی بدمذاقی میں سوائے کنگال اور بھک منگوں کے اور کون پھنسا ہو گا- بیچاروں کو ہزار ہزار نوٹ چار چار تین تین سو میں بیچنا پڑے- ذرا حساب لگایئے تو معلوم ہو گا کہ ایک کنگلے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اٹھانا پڑا- اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندوستان میں گداگری کی لعنت ہے-

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں- کبھی بزنس کی ہو تو کالے گورے کا پتہ چلے- یہ بزنس مذاق نہیں اٹھے اور ناچنے لگے- اکنومکس کے بارے میں الف کے نام لٹھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقیدیں کریں! یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم ---- مانگ زیادہ مانگ کم رسد

کے بارے ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کما سکتا ہے کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کما سکتا۔ صاحب! یہ تو بزنس کے گر ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی۔ اجی یہی چاول بھوسے کے بھاؤ پھنکتا۔

اگر آپ یونہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان میں بھی وہی ہوگا۔ جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے۔ خواہ آپ کتنی بھی سستی ستا رہی ہو۔ کام ضرور کرنا پڑے گا۔ آپ کے پیارے بچے یتم خانوں میں چلے جائیں گے اور بیوی سرکاری طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہوگا۔ چاہے پوچھ لیجیے بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال چیونٹے تہذیب اور تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ اننہ پتہ نہیں بھئی یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ ہی کہتے ہیں تو کیا خدانخواستہ مذاق کرتے ہیں۔

کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ! ذرا سوچئے اگر ایک موٹے بنئے میں ایک سوکھا مارا مسلمان گھول دیا جائے تو کتنا بڑا ڈھیر ہو جائے گا۔ ابل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چپچپاتے پسینے میں غرق ------۔ جی چاہتا ہے بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر ڈالیں نہیں بھئی میں کھچ پچ سے بہت ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندوستان کا جوڑ ہی کیا۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اللہ توبہ بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں۔ ٹھنڈے انجن میں بس بھاپ کی کسر ہے اگر غلطی سے پوری ہوگئی تو بس لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہ جائیں گے اور یہ ہیبت ناک انجن اس جگمگاتی دنیا کو روندتا سرمست ہاتھی کی طرح دندناتا اللہ جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہٰذا ابھی وقت ہے جاگتے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے کا

مقابلہ کر ڈالیئے۔ ان کے بل معلوم کیجئے اور تیز سے تیز فلٹ کا نسخہ ایجاد کر کے استعمال کیجئے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے۔ ان جراثیم کی تلاش میں آپ اچھے بھلے تندرست جسم چیرنا پڑیں گے۔ ہزاروں ناموں اور کاموں کی آڑ میں چھپے یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں۔ تو کہیں ادب کی ٹٹی کی آڑ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے نرت اور سنگیت کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ تو کہیں پردہ سیمیں کے نیچے سماج کے حق میں دیمک بن کر رینگ رہے ہیں۔

انہیں ڈھونڈ نکالیئے۔ ہوشیاری سے نتھنے پھیلا کر سونگھیئے۔ ان کی بساند ملک کے کونے سے خود دوڑی آئے گی۔ اور بس ناک کی سیدھی میں دوڑ کر انہیں پکڑ لیجئے اور پھر انجمنیں قائم کیجئے، جلسے کیجئے، لکچر دیجئے، ریزولیوشن پاس کرائیے۔ ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایسا جال بچھایئے کہ قدم قدم پر منہ کے بل گریں، ان کے اخبار جلا دیجئے، ان کی پیشانیوں پر سرخ لوہے سے بالشویک داغ دیجئے، یہ سب بالشویک ہیں۔ گویا جانتے نہیں، ان کی تحریروں پر دفعات لگائیے۔ مقدموں کے ذریعے بھنگنیاں دے کر پست کر ڈالیئے۔ تاج شاہی کی مدد لے کر کچہریوں میں گھسیئے، اور جہاں ملیں جب ملیں ان کی تباہ کر دیجئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام بااثر روسا، علماء دین اور سرکاری افسروں کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجئے، ہال کے باہر پکٹنگ کیجئے اور اندر دنگا مچایئے۔ اسٹیج پر اینٹیں اور پتھر پھینکئے اور اتنا اودھم مچایئے کہ طبل جنگ کی پکار وہیں نیم مردہ ہو کر سسکنے لگے۔ ورنہ یاد رکھئے اگر یہ خونی گرج ایک بار نئی پود کے کچے کانوں میں گونج گئی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور آج تلاطم میں نے راج کے سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا۔ وہ ننگی تلواریں جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آنکھوں میں جگمگا اٹھیں گی۔

آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ یہ بات ہنسی میں ٹالنے کی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ

اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لٹکا دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے کہ آپ کو دست تاسف ملنا پڑے، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھلیان کر چکی ہوں گی اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہوگا۔ پھر اس وقت آپ کتنا ہی پچھتائیں، نادم ہو، مجھے یاد کریں، میرا مجسمہ بنوا کر شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں کچھ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ دیکھئے اگر یہ لال چونٹے موجودہ نظام کے جسم کو ایک دفعہ لپٹ گئے تو اس جنم میں تو نہ چھوڑیں گے۔ اور پھر بھیانک زخم کس مرہم سے پر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھانے پر تل ہی جائے تو خبردار ٹکٹ ہرگز نہ خریدئے گا۔ اور نہ کسی کو خریدنے دیجئے گا، ہاں اگر مفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر پریتی سرکار کی روپہلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی، تھرکتی، اٹھلاتی آواز۔ بنوے کی اتھا سمندر جیسی گہری گونجتی گرجتی ابھرتی ڈوبتی تانیں، اور ریبا کی برساتی جھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی میٹھی میٹھی مرکیاں تھوڑی دیر کے لئے انسان کو..... لاحول ولا قوۃ میں پروگرام پسند کرتے کرتے بچی!

چوتھی کا جوڑا

سہ دوری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی ہوئی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منہنی سا چرچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرا لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان کے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو' اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ جوڑ لئے گئے تھے' مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبری کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا' ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے' کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی' کبری کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبری کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں کلف توڑتیں' کبھی تکون بناتی کبھی چوکنا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیرا تو نکل آئے گا' گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لو"

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کی یقین تھا کہ آج تو

کبری کی ماں ناپ تول ہار جائے گی' جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تاک رہے تھیں۔ کبری کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی' چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں' لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں' جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو' اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلّہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری' گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے نئی بیاہی ہوئی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے کبری کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے' ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگ کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبری کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زرد مائل ٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگ مگا اٹھتا۔۔۔۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا' ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کی اس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہوگئے مگر کبری کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہوجاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا' اور پھر ایک نئے جوڑے کے

ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے صاف ستھری جازم بچھتی محلّہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجیں بجاتی آن پہنچتی۔

"چھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اتر آئے گی' پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا۔ لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبری کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کرکے قہقہ لگاتیں ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی' کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی' بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا' اور جب کوئی قہقہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جائیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبری شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت کٹ جاتی۔ کبری سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی' کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو وہ جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا یا تو دولہ کی داشتہ نکل آئے گی یا اسکی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہو گا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا ہے۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا ہے کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے روز سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا ذرا سی کتر بھی بچی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا

ہے۔ عمرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آگئے۔ کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑے ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی، اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کردے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور اب کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ وہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے

سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے۔ اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوی دی۔

اور کبری کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگ کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا ڈوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آرہا ہے۔ بی اماں تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دور پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ۔

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی بیچ میں ایک نظر دونوں کبری پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھا طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکرو چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز

نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبری نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا کمرہ تو چٹا ہوگیا مگر اس کی ہتھیلوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہوگئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے' دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبری پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کرکے وہ بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبری کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں" وہ شرم سے جھک گئی۔"

حمیدہ چھیڑتی رہی' بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول' پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دلی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے' کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتیں "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گلہ گھونٹ پی کر راحت کے لئے

پراٹھے تلتی ہے' دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی بلائی پڑے' اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھردے' اور کیوں نہ بھرے آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کی پلکوں کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں' وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں' بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکئے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں' پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا اور شام کو آکر کوفتے کھاکر سو جاتا اور بی اماں کو منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ ہو بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج' خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے" بی اماں نے فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ توڑوانے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑی! بہنوئی سے کوئی بات چیت کوئی ہنسی مذاق' اونہہ اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا!؟" بی اماں چڑھ کر بولیں۔

"نہیں تو مگر..... میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں۔

"دیکھو ہنسنا نہیں' تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔ میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی'وہ کیسا منہ بناتا ہے' اے ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی ماند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں' قہقہہ لگاؤں کہ:

"واہ جی واہ دولہا بھائی کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا' اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان کو کیا کہتی کہ وہ مزے سے کھا رہا ہے کمبخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں نے کے سکھانے پر میں نے پوچھا!

جواب ندارد

"بتایئے نا؟"

"اری ٹھیک سے جاکر پوچھ" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔ آپ

نے لاکر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی بی اماں سے نہ رہا گیا۔

تمہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟" ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھونسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

"کہئے آج کیالائی ہیں؟" آج تو لکڑی کے برادے کی بادی ہے"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سامعلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب

تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ گئی۔ سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور آپ اسے دودھ ملائی نگلوائیں میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کردیا۔ بی آپا تو چولہے میں جھونکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں، بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس اسے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولہے کی اڑتی ہوئی راکھ ..... نہیں

...... میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا' میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہوگئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونھ" میں جل گئی۔ پھر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہوگئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے کے والے کے ہاتھ کھا جاؤں ...... اوہ نہیں ...... کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کھردار ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں' پانی بھرتے ہیں' پیاز کاٹتے ہیں' بستر بچھاتے ہیں' جوتے صاف کرتے ہیں یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہیں آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہیں چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان کبھی سہاگ کا عطر نہ سے گا؟ جی چاہا زرو سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو ...... مگر راحت کے نہ تو کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

اور کہہ رہے تھے "اپنی بی آپا کے سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ....."

"اری چپ مردار۔" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی، تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کیلئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکھنی

ہیں- انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما-

مگر میں چپ رہی- بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے- وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں- کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں- دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں-

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے- دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے-"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ' ناک' گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری- بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں-

"وہ بولے" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا-

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں-" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی-

"کیوں؟" وہ مسکرائیں-

"مجھے اچھے نہیں لگتے...... دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں-" میں نے کانپتے ہوئے کہا-

"بڑے شریر ہیں-" انہوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا-

"بی آپا..... سنو بی آپا- یہ راحت اچھے آدمی نہیں-" میں نے سلگ کر کہا- "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی-"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جاء نماز بچھاتے ہوئے کہا-

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں-"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں-

"ہاں-"

"خوب کیا- تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے- اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا- بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں-" پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی

چوتھی میں بدلہ لے لیجو وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو ممیری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پر لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں' شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں' کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہوا اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے

جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہو گا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی' دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہو گی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں' وہ بھی نکل جائیں گی' آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کی چھیڑ رہی تھیں۔ اور وہ خون کی بچی کچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا' اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس

ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا- وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا- یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا- میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے- میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں- دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرہ پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے.....

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی' شرم سے نڈھال' آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی بی آپا چلی آ رہی ہیں..... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے- بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے....... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں' ایک بار اوپر اٹھتی ہیں' شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے-

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے-" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے..... حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نہ میری بہنو-" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی-

"یہ...... یہ ملیدہ-" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بابنی میں گھس آئی ہو' اور پھر پہاڑ کھسکا......! اور منہ کھول دیا- وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی- مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو' کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا-

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا..... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھا غار کی گہرائیوں میں' اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا-

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئیں- باہر آنگن میں محلّہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں-

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے' پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے' دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ بیٹھی اور انہوں نے چپ چاپ اپنا مراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی' گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہیں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا' اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں' بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر...... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS
Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/=